سنگریزے اور جواہر

(ذاتی ڈائری)

سیّد غلام الثقلین نقوی

سنگریزے اور جواہر

(ذاتی ڈائری)

سیّد غلام الثقلین نقوی

کتاب کا نام...... سنگریزے اور جواہر
مصنف........... سیّد غلام الثقلین نقوی
تدوین وطباعت...... نصیر عباس نقوی
ناشر............... ظہیر الحسن نقوی، نصیر عباس نقوی، مشیر عباس نقوی
کمپوزنگ.......... راشد حبیب نقوی
سال اشاعت..... 2017ء

بڑے ابا جی

زندگی میں کچھ ہستیاں ہماری روح میں ضم ہوتیں ہیں۔ ان کا مادی وجود چاہے اس بے ثبات دنیا میں ہمارے ساتھ نہ بھی ہو مگر نہ جانے کیوں ہمارے آس پاس ان کا احساس باقی رہتا ہے۔ میرے ساتھ بڑے ابا جی غلام الثقلین نقوی کا رشتہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ غمِ روزگار کے بھنور میں چکر کاٹتے میرا وجود اور روح کبھی اس احساس سے خالی نہیں ہو پائے اور اسے میں اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں۔

آج برسوں بعد ان کی ذاتی ڈائری ''سنگریزے اور جواہر'' پر لکھنا میرے لئے آسانی کے ساتھ ساتھ مشکل بھی ہے۔ آسانی کی بات کریں تو جیسے وہ میرے سامنے ہوں' باتیں کر رہے ہوں۔

اس وقت جب میں یہ تحریر لکھ رہا ہوں تو مجھے یہ محسوس ہو رہا ہے کہ وہ اپنی چارپائی پر بیٹھے ہیں سامنے میز پر اُن کی کتابیں پڑی ہیں اور وہ اپنے پارکر پین سے لکھ رہے ہیں۔ وہ پارکر پین آج بھی میرے پاس ہے اور یہ چند ٹوٹے پھوٹے الفاظ اُسی سے تحریر کردہ ہیں۔ مجھے دیکھ کر ابھی کہیں گے مدثر بڑے دنوں کے بعد آئے ہو۔ کچھ اس کمرے کے باہر کا حال سناؤ مگر ان کی سمندر جیسی وشال شخصیت پر بات کرنا میری طاقت سے بالاتر بھی ہے۔

لگ بھگ بارہ سال کے عرصے پر محیط یہ تحریر روحانی' ادبی' سیاسی' ثقافتی' تاریخی' معاشرتی اور نفسیاتی حوالے سے شاہکار ہے۔ کسی بھی تحریر کا بڑا پن تین باتوں پر ہوتا ہے۔ موضوع' الفاظ اور ادیب کا تخیل۔ موضوع اور الفاظ میں اکسارتا (ترتیب) تبھی ممکن ہوتی ہے جب ادیب کے اندر کا سچ الفاظ میں بناوٹی نہ لگے۔ ''سنگریزے اور

جواہر'' کے واقعات اور بڑے ابا جی کی شخصیت کا گواہ میں خود ہوں۔ ان کی تحریر پڑھتے میں کسی اور عالم میں رہا۔ جیسے وہ سامنے بیٹھے سب باتیں سنا رہے ہوں اور میں ہمہ تن گوش' ہاتھ باندھے ان کے چہرے پر نظریں لگائے سنتا چلا جا رہا ہوں۔ جیسے اپنے خاندان پر بنی کوئی ڈاکومنٹری فلم دیکھ رہا ہوں۔ جس میں سارے رشتے ناطے' ان کا بچپن' جوانی' حالات' پیار و محبت اور اخلاقی اقدار سے بھرے کردار اپنا رول نبھاتے چلے جا رہے ہوں۔

''سنگریزے اور جواہر'' میں ان کی ذات کا سب سے بڑا پہلو عشق الٰہی نمایاں ہے۔ یہ کائنات ایک مثلث ہے۔ جس میں خدا' انسان اور کائنات تین زاویے ہیں۔ ہر ایک کا دوسرے کے ساتھ تعلق موجود ہے۔ اس مثلث میں بڑے ابا جی نے دنیاوی کاموں کے دوران بھی خدا والے زاویے کو لمحہ بھر دھیان سے اوجھل نہیں ہونے دیا۔ نبی کریمؐ کی محبت اور غم حسینؓ ان کی روح اور شخصیت کا خاصہ تھا۔ محرم الحرام کے دنوں میں لکھی ان کی تحریر ان کی ذات کا عکس ہے۔ شام غریباں پر لکھتے ہیں:

''اس رات کے ساتھ وابستہ سارے مناظر میری نگاہوں میں پھرتے رہیں گے لیکن میں پھر بھی سو جاؤں گا۔ ذاکر نے اس رات کی بھیانک ویرانی کا جو نقشہ کھینچا تھا، اسے دماغ پر مرتسم کر کے سو جاؤں گا۔ تھکا ہوا ذاکر بھی سو جائے گا۔ ممکن ہے یتیم، بے آسرا بچے جنہوں نے خون آشام ظہر اور عصر کے درمیان کی چند ساعتوں کا لہو رنگ منظر دیکھا تھا۔ وہ بھی سو جائیں۔ ممکن ہے کہ سید سجادؑ غش کی حالت میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جائیں کہ گیارھویں محرم سے ان کے صبر و رضا کا جو امتحان ہونا ہے، اس کی تیاری کے لیے دو چار ساعتوں کا آرام حاصل کر لیں (قدرت کو بھی یہی منظور تھا ورنہ وہ جوان جو دسویں محرم کو بیماری کی وجہ سے

بستر سے اٹھ نہیں سکتا تھا۔ گیارھویں محرم کی صبح کو قافلے کے سب سے اگلے اونٹ کی مہار تھام کر اور زنجیریں پہن کر کوفہ وشام کے دور دراز سفر پر روانہ کیسے ہوسکتا) بڑا امکان ہے کہ ام کلثومؑ، ام اربابؑ، ام فروہؑ، رقیہؑ، فاطمہ کبریٰؑ اور اصحابِ حسینؑ کی بیویوںؑ کی آنکھ بھی جھپک گئی ہو لیکن ایک خاتون ہیں کہ صبر و رضا کا پہاڑ بن کر اپنے مقام پر کھڑی ہیں کہ نیند ان سے کوسوں دور بھاگ رہی ہیں اور یہ خاتونؑ ہیں حضرت زینبؑ (میرے ماں باپ اُن پر فدا) جو وہ مسلسل جاگ رہی ہیں۔ لیکن میں پھر بھی سو جاؤں گا۔''

ان کی تحریر میں اپنی ذات کے بارے' خدا سے رشتے کے بارے سوچنا۔ مادہ اور روح کے تعلق کو سمجھنا' مادہ کی حقیقت کی نفی اور روح کے سچ کو ماننا' یہ سب پڑھتے پڑھتے میرا دھیان بار بار بلھے شاہؒ کی کافی ''کیہ جاناں میں کون'' کی طرف جاتا رہا۔ خدا سے عشق کرنے والوں کے راستے بھی کتنے ملتے جلتے ہوتے ہیں۔

بڑے اباجی کی شخصیت کا ادبی پہلو ویسے تو ایک ایک سطر میں دکھائی دیتا ہے مگر ایک جگہ تو ادھورے افسانے کے مکمل ہونے کی خوشی ان کے الفاظ میں ناچتی دکھائی دیتی ہے لکھتے ہیں:

''14 نومبر 1987ء کی صبح کو ایسا اتفاق ہوا کہ میں نے 'ایک افسانچہ' مکمل کر لیا۔ یہ نامکمن افسانہ ایک مدت سے میری نوٹ بک میں ادھورا پڑا ہوا تھا۔ اس کا انجام نہیں سوجھ رہا تھا۔ اس صبح کو سوجھ گیا اور افسانہ تکمیل تک پہنچ گیا۔ میں بہت خوش ہوا کہ روانی طبع پر جو بند لگ گیا تھا' وہ ٹوٹ گیا ہے۔ میں حیران بھی ہوا کہ ''افسانے'' کے ساتھ ٹوٹا ہوا رابطہ اتنی آسانی سے کیسے بحال ہو گیا۔ حیرت اب تک قائم ہے اور خوشی باقی نہیں رہی کیونکہ جس

افسانہ نگار نے یہ افسانہ مکمل کیا تھا، وہ پھر اپنے خول میں سمٹ گیا ہے۔''

ریٹائرمنٹ اور اس کے بعد کی زندگی بھی ان کی ڈائری کا موضوع ہے۔ پونچھ ہاؤس سٹاف کالونی کے ایک کواٹر سے بیٹے بہوؤں کے ساتھ 174 بدر بلاک شفٹ ہوئے۔ اور اب اُن کی مصروفیات لکھنا اور پڑھنا تھی لیکن پوتوں اور دوھتوں کی محبت اور اُن کو وقت دینا بھی اُن کی اولین ترجیح تھی۔ البتہ مصروفیت اور محبت کا محور پوتا قنبر عباس تھا۔ سچ ہے مول سے بیاج پیارا ہوتا ہے لکھتے ہیں:

''میں نے اپنے بیٹوں اور بیٹی کو اپنے لئے کبھی فتنہ نہیں بنایا (الحمداللہ) لیکن میرے پوتے اور پوتیاں دوھتے میرے لئے فتنہ ضرور بن گئے ہیں (شکرالحمداللہ)۔''

بڑے اباجی کی محبت وشفقت اپنی اولاد کے علاوہ اپنے بھتیجوں اور بھانجوں سے بھی کم نہ تھی۔

1980ء میں جب میرے والد صاحب وفات پا گئے تو ہم انہیں کے سہارے اور محبت سے مشکل مرحلوں سے ہمکنار ہوئے۔

شادی کے بعد ایک دن ہم اپنی خالہ (غلام الثقلین نقوی کی شریک حیات) جنہیں میں آپاجی کہتا تھا ملنے گیا تو انہوں نے میری بیوی کو ایک نصیحت کی کہ اسے لکھنے نہ دینا ساری عمر اکیلی رہ جاؤ گی۔

اب یہ احساس آپاجی کا ہوسکتا ہے لیکن غلام الثقلین نقوی حقیقتاً سب کا خیال رکھنے والے انسان تھے۔ لکھنا کبھی ان کا ذریعہ معاش نہیں رہا۔ چنانچہ معاشی مجبوریوں کے لئے نہیں لکھا۔ خاندان کو بھی وقت دیا۔ آپاجی کی وفات پر جو کچھ لکھا وہ ان کے جذبات کی صحیح عکاسی کرتا ہے۔

''آج 25 دن بعد یہ سطور لکھتے وقت میں رو رہا ہوں یوں گزشتہ

دنوں کئی بار میں نے ان کی جدائی محسوس کی' آنسو بھی بہائے لیکن رونا صرف آج آیا۔''

وہ ایک سچے انسان' مخلص پاکستانی شہری اور پکے مسلمان تھے۔ ان کا سیاسی حالات پر لکھا روزنامچہ اعلیٰ بصیرت کا نمونہ ہے۔ ایک پاکستانی شہری کا بہترین تجزیہ ہے۔ جو سیاسی پارٹیوں کی منافقت کو بے نقاب کرتا ہے لکھتے ہیں:

''صدر ضیاء الحق بعدازاں نہایت زیرک اور معاملہ فہم مدبر ثابت ہوئے۔ آہستہ آہستہ انہوں نے اپنا مقام بنا لیا۔ 90 دن کا وعدہ گیارہ سالوں پر محیط ہوگیا۔ 'وعدہ خلافی' اسی قرآن کی رو سے ایک بہت بڑا گناہ تھا جس کی آیات پڑھ کر وہ اپنی تقریر کا آغاز کرتے۔ اس وعدہ خلافی کو انہوں نے اپنے اقتدار کے قیام و استقرا کے لیے استعمال کیا۔...... میں نہیں جانتا کہ وہ نفاذِ اسلام کے بارے میں مخلص تھے یا ریاکار لیکن میں اتنا جانتا ہوں کہ پاکستان میں نفاذِ اسلام کی تحریک کو جتنا نقصان ضیاء الحق مرحوم نے پہنچایا ہے اور کسی نے نہیں پہنچایا۔ یہی کچھ بھٹو مرحوم نے اسلامی شولزم کے ساتھ بھی کیا تھا۔''

ان کی ذات فطرت کے بہت قریب تھی۔ انسان کے باطن کا سچ ہی اُس کو فطرت کا قرب نصیب کرتا۔ اسلام آباد میں اہل قلم کانفرنس کا ایک واقعہ لکھتے ہیں:

''قیام ہالی ڈے اِن ہوٹل کے کمرہ نمبر ۱۱۲ میں تھا۔ صبح نماز پڑھ کر شیشے سے پردہ سرکاتا تو سامنے 'مارگلہ' کے پہاڑ لپک کر آتے اور کھڑکی سے مل جاتے۔ ایک عجیب سا کیف دل و دماغ کو اپنی بھرپور آغوش میں لے لیتا۔ وہ جو کسی نے کہا ہے کہ ہم جیسے کامل ایمان لوگوں کے لئے رسول نہ بھی آتے تو صبح کافی تھی۔ صرف

اس تعریف کے ساتھ معلوم ہوتا کہ اللہ کے رسولوں میں سے ایک رسول اس کی 'صبح' بھی ہے۔ اسلام آباد کی یہ دھلی صاف شفاف صبح 'ایمان' میں اضافے کا باعث ہوئی۔''

ایسے انسان ایک گھنے درخت کی مانند ہوتے ہیں۔ خود دھوپ سہتے ہیں لیکن معاشرے کو چھاؤں بخشتے اور پھل دیتے ہیں۔ مگر صحراؤں کی آندھیاں' زمانے کی تپش آہستہ آہستہ تنے کو روگ لگاتی چلی جاتی ہیں۔ غلام الثقلین نقوی کی ذات پورے معاشرے کے لئے ایک درخت جیسی تھی۔ سب انسانوں کا دُکھ اُن کو اپنا دُکھ لگتا۔ لاہور ریلوے اسٹیشن پر بم دھماکہ ہو یا کراچی کا بازار، ہر جگہ ان کو اپنے پرخچے اڑتے دکھائی دیتے۔ دوسروں کی موت میں انہوں نے سانس سانس اپنی موت کو دیکھا۔

زمانے کے دُکھ ان کی زندگی کے سنگریزے تھے اور زمانے کے سُکھ جواہر۔

آج ان کو ہم سے رخصت ہوئے 15 سال بیت گئے مگر جیسے اب بھی میرے پاس ہوں میں اپنی زندگی کی 52 بہاریں دیکھ چکا ہوں مگر آج بھی چلتا ان کی انگلی پکڑ کے ہی ہوں۔ خدا یہ ساتھ آنے والی نسلوں کو بھی نصیب کرے۔ آمین

مدثر رضا نقوی

سنگریزے اور جواہر

(ذاتی ڈائری)

1986 تا 2002ء

غلام الثقلین نقوی مرحوم ۱۲ مارچ ۱۹۲۳ء کو مقبوضہ جموں کشمیر کے ایک گاؤں ''چوکی ہنڈن'' ضلع نوشہرہ میں پیدا ہوئے، جہاں ان کے والد سیّد امیر شاہ مرحوم بسلسلہ ملازمت مقیم تھے۔ سکول ریکارڈ کے مطابق، ان کی تاریخ پیدائش ۲۱ مئی ۱۹۲۳ء ہے۔ آبائی گاؤں کا نام ''بھڑتھ'' ہے، جو سیالکوٹ شہر کے شمال کی طرف تین میل کے فاصلے پر واقع ہے یہیں ان کے بچپن اور لڑکپن کا بیشتر حصہ گزرا۔

پرائمری سکول بھڑتھ، سکاچ مشن سکول سیالکوٹ چھاؤنی، ڈبی بی ہائی سکول دیپالپور، مرے کالج سیالکوٹ اور سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور میں تعلیم حاصل کی۔ تعلیمی قابلیت ایم اے (اُردو) بی ٹی ہے۔ ۳۷ سال درس و تدریس کے پیشے سے منسلک رہ کر، ۲۰ مئی ۱۹۸۳ء کو گورنمنٹ کالج لاہور سے اسسٹنٹ پروفیسر، اُردو کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ ۱۴ اپریل ۲۰۰۲ء (۷۹) سال کی عمر میں وفات پائی۔

بعداز وفات ان کی دو کتابیں پچیس منتخب افسانے اور کالموں کا مجموعہ ''پانچواں طبقہ'' کے عنوان سے شائع ہو چکے ہیں۔ اب کی ان کی ذاتی ڈائری ''سنگریزے اور جواہر'' کے عنوان سے شائع کی جا رہی ہے امید ہے کہ اردو ادب میں اضافہ کا باعث ہوگی۔

وہ لمحہ

4 نومبر 1986ء

دو تین روز ہوئے، ایک افسانے کا خیال ذہن میں آیا۔ ایک ایسا لمحہ جب آدمی کی شخصیت دو ہستیوں میں تقسیم ہو جاتی ہے یعنی شیزوعزینک کیفیت۔ وہ آدمی جو اصل سے علیحدہ ہوتا ہے۔ ایک لمحہ کے دوراہے پر کھڑا ہوجاتا ہے۔ اب پتہ نہیں یہ اصل آدمی ہے یا وہ جس سے یہ الگ ہوا۔ اس 'لمحے' پر اُسے زندگی اچانک بے معنی لگتی ہے۔ بے مقصد اور لایعنی۔ موجودی فلسفی شاید اسے absurd moment کا نام دیتے ہیں۔ مجھے معلوم نہیں یہ لمحہ اگر مختصر ہو تو الگ ہونے والی شخصیت پھر اصل شخصیت میں مدغم ہوجاتی ہے۔ یہ لمحہ لمبا ہوجائے تو صدیوں پر حاوی ہوجاتا ہے۔

کامیو نے اپنے مختصر ناولوں میں اسی لمحے کی عکاسی کی ہے۔ عبداللہ حسین نے اپنے افسانوں کے مجموعے ''نشیب'' کے اکثر افسانوں میں اسی لمحے کی عکاسی کی ہے۔ ''دھوپ'' میں جو شخص خودکشی کرتا ہے۔ اس پر یہی لمحہ وارد ہوتا ہے۔ اسی طرح ''نشیب'' کی مرکزی خاتون اسی لمحے کا شکار ہوکر زندگی سے اتنی بے نیاز یا بے زار ہوجاتی ہے کہ اُس کا خاوند اس کیفیت کو بے وفائی پر محمول جان کر اُسے جان سے مار دیتا ہے۔

''یہ لمحہ'' مجھ پر بھی ایک دو بار وارد ہوا ہے۔ اس ایک لمحے میں زندگی جس قدر بے معنی اور بے مقصد معلوم ہوئی۔ اُس کی کیفیت میں بیان نہیں کرسکتا۔ کیا اس لمحے پر میں افسانہ لکھنے پر قادر ہوسکتا ہوں۔

یہ چند سطور لکھ رہا ہوں اور ٹیلی ویژن پر وَن ڈے کرکٹ میچ ہو رہا ہے۔ پاکستان اور ویسٹ انڈیز کے درمیان.......... گوجرانوالے میں.......... ان کھلاڑیوں کے لیے زندگی کتنی بامعنی اور بامقصد ہے۔ جو ٹیم ہار جائے گی، ممکن ہے کہ اُس کے کسی فرد پر یہ لمحہ وارد ہوجائے۔

عالمِ حیرت

7 نومبر 1986ء

کہتے ہیں کہ صوفی کے روحانی سفر میں ایک منزل ایسی آتی ہے جسے ''عالم حیرت'' کا نام دیا جاتا ہے۔ مرشد کی توجہ حاصل ہو تو سالک اس منزل سے آگے نکل جاتا ہے ورنہ اسی جگہ میں بھٹکتا رہتا ہے۔ اسے جذب کی منزل بھی کہا جاتا اور اس منزل کے باسی کو مجذوب کہتے ہیں۔ مجذوب بظاہر دیوانہ نظر آتا ہے، ممکن ہے بباطن فرزانہ ہوتا ہو۔ علامہ اقبال نے نٹشے کو اسی بنا پر ''مجذوب فرنگی'' کہا ہے۔

اگر ہوتا وہ مجذوب فرنگی اس زمانے میں
تو اقبال اُس کو سمجھاتا مقام کبریا کیا ہے

میرا خیال ہے کہ حیرت کی یہ کیفیت ہر انسان پر وارد ہوتی ہے۔ ہر سوچنے والے آدمی کے ذہن میں کائنات، اُس کے مبدا و تخلیق، اس کی انتہا کے متعلق چند بنیادی سوال ضرور پیدا ہوتے ہیں۔ جب ان کا منطقی جواب اُنہیں نہیں ملتا تو وہ یا تو قطعی ملحد ہو جاتا ہے یا agnostic بن جاتا ہے۔ agnostic یہ کہہ کر اپنی جان بچانے کے کوشش کرتا ہے کہ میں نہ حقیقت اولیٰ کو مانتا ہوں نہ اس سے انکار کرتا ہوں۔ گذشتہ چار پانچ ہزار سے انسان نے منطق اور فلسفہ کی ایجاد و اختراع کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ہر معلول کی کوئی نہ کوئی علت ہوتی ہے لیکن علت و معلول کا سلسلہ علت اولیٰ پر جا کر رُک جاتا ہے جسے First Cause کا نام دیا جاتا ہے یعنی خدا کیسے وجود میں آیا۔ اُس کا پیدا کرنے والا کون ہے؟ برٹرنڈ رسل نے بھی یہی سوال کیا ہے اور اس کا منطقی جواب اُسے نہیں ملا اور اُس نے کہا میں نہ اس علت اولیٰ کو مانتا ہوں اور نہ اس سے انکار کرتا ہوں یعنی agnostic ہوں۔

مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ میں نے بھی ایسا ہی سوال اپنے بچپن میں اپنے

والد مرحوم سے پوچھا تھا کہ خدا کو کس نے پیدا کیا۔ انہوں نے جواب دیا تھا کہ خدا کا لفظ ''خودآ'' کا مرکب ہے (آمدن سے آید مضارع ہے اور آ فعل امر ہے۔) جس کے معنی ہیں خود آنے والا۔ اس ہستی کو صرف ایمان و یقین کی روشنی میں سمجھا جاسکتا ہے۔ وہ دن اور آج کا دن، میں ''عالم حیرت'' میں مبتلا ہوں۔ کائنات کی وسعت اور پُراسراریت پر غور کرتا ہوں تو اکثر لرزہ براندام ہوجاتا ہوں۔ سائنس وقتاً فوقتاً تخلیق کائنات کے متعلق Thories پیش کرتی رہتی ہے مثلاً Big Bang Theory، یہ Theories بھی مجھے عالم حیرت میں مبتلا کر دیتی ہیں؟ کائنات کی تخلیق (دُخان یا دھواں) کیسے ہوئی؟ کس نے کی؟ یہ ہیولے کیسے وجود میں آگئے؟ آپس میں کیوں ٹکرائے؟ اس Big Bang سے لاتعداد کہکشائیں وجود میں کیوں آئیں؟ ہر کہکشاں لاکھوں سورج کس طرح روشن ہوئے؟ پھر ہر سورج کا اپنا نظام شمسی کیسے مرتب و منفیط ہوا؟ اس نظام شمسی کا ہم ایک حقیر ذرہ ہیں، اُس کے ایک بہت ہی چھوٹے سے ٹکڑے یعنی زمین پر زندگی نے کیسے جنم لیا؟ جو علت و معلول کی زندگی ہم گزار رہے ہیں۔ کیا اس چھوٹے سے ذرے پر اس کے علاوہ ایک اور زندگی بھی ہے جس کے علت و معلول ہماری سمجھ سے بالاتر ہیں۔

پھر یہ اپنا جسم ہے جس کے اسرار سے میں خود آج تک واقف نہیں ہوسکا۔ میری روح کا اسرار نہ جانے کتنا عمیق ہے کہ اُس تک رسائی ممکن بھی ہے یا نہیں۔ کیا صوفیا اپنے روحانی سفر میں اس اسرار کی کسی رمق کو پالیتے ہیں۔ اُنہیں عالم حیرت میں کیا نظر آتا ہے کہ دیوانگی و جنون کا شکار ہو جاتے ہیں؟ مجھے کچھ معلوم نہیں۔ میں خود ''عالم حیرت'' میں مبتلا ہوں۔ میں نماز پڑھتا ہوں، تلاوت کرتا ہوں، نہج البلاغہ اور صحیفہ کاملہ کا روزانہ مطالعہ کرتا ہوں اس کے باوجود وہیں ہوں جہاں کبھی تھا یعنی بچپن کا وہ سوال ابھی تک تشنۂ جواب ہے جو میں نے والد محترم سے کیا تھا؟

جگنو کی چمک

7 نومبر 1986ء

24 اکتوبر 1986ء جمعے کی نماز امامیہ مسجد سمن آباد میں پڑھی۔ اب یہ یاد نہیں آرہا کہ نماز کی دو رکعتوں میں کوئی لمحہ آیا تھا یا بعد کی ظہر کی نماز میں جو میں نے فرادہ پڑھی، میں نے ''شدید مسرت'' کے ایک لمحے کو اس طرح محسوس کیا جیسے اندھیرے میں ایک ستارہ ٹوٹا ہو یا کوئی جگنو چمک گیا ہو۔ میں اس کیفیت کو وضاحت سے بیان نہیں کر سکتا۔ خوشیوں کے بہت سے لمحے نصیب ہوئے ہیں لیکن اُن میں اتنی ''شدت'' نہیں تھی جو جگنو کی اس چمک میں تھی۔

کیا یہ لمحہ پھر کبھی آئے گا؟

مہاتما بدھ نے سخت ریاضت اور تپسیا کے بعد ایک روشنی دیکھی تھی، جس کی تفصیل وہ بیان نہ کر سکے۔ اس ''روشنی'' میں انہوں نے کیا بنیادی سوالات کے جوابات پالیے تھے یہ کیفیت صرف ایک intense happiness کی تھی جس کی تلاش میں انہوں نے پھولوں کا بستر چھوڑا تھا اور کانٹوں پر بسیرا کر لیا تھا؟ کیونکہ 'نروان' حاصل کرنے کے لیے جو نکات انہوں نے عامۃ الناس کو سکھائے، وہ ایک ایسی حقیقتیں ہیں جو ہمیں آج پیش پا افتاد معلوم ہوتی ہیں، ان تک پہنچنے کے لیے اتنی تپسیا کی ضرورت قطعی نہیں تھی۔

اللہ بہتر جانتا ہے!

یوں جتنے بھی پیغمبر انسان کی ہدایت کے لیے مامور ہوئے ہیں، وہ ریاضت اور تپسیا کی اس کٹھن منزل سے ضرور گزرے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شبانی، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جنگل اور صحرا میں تنہائی کی عبادت، حضرت محمد مصطفٰے کا غارِ حرا میں قیام وغیرہ۔

اولادِ درِ اولاد

26اپریل 1987ء

22 اپریل کو رات کے آٹھ بجے قنبر عباس کی تیسری سالگرہ کی سادہ سی تقریب ہوئی۔ مدعوئین میں سلمان صغیر (عمر پانچ سال) اور میثم رضا (عمر سات ماہ) وی آئی پی کی حیثیت رکھتے تھے۔ یہ دونوں میرے دوسرے فرزند صغیر الحسن کے بیٹے ہیں۔ صائمہ، عظمیٰ اور زہیر گھر کے آدمی تھے۔ صائمہ، عظمیٰ، زہیر اور قنبر میرے سب سے بڑے فرزند ظہیر الحسن کے بیٹے بیٹیاں ہیں۔ دو پوتیاں عقیلہ اور فضیلہ مکہ مکرمہ میں حرم خدا کے سائے تلے رہتی ہیں۔ وہ میرے تیسرے بیٹے نصیر عباس کی بیٹیاں ہیں۔ چوتھا بیٹا مشیر عباس بھی ماشاء اللہ عنقریب صاحبِ اولاد ہونے والا ہے۔ عفت بتول میری بیٹی راولپنڈی میں مقیم ہیں جہاں اُس کے میاں سید غلام السیدین نقوی ملازمت کرتے ہیں۔ اُن کے ماشاء اللہ چار بیٹے ہیں ذریت، مغیث، معین اور اویس۔

آدمی بھی عجیب شے ہے۔ ہر حیوان اپنی اولاد کو سال ڈیڑھ سال محبت اور رافت کا سایہ دینے کے بعد بھول جاتا ہے۔ انسان اپنی اولاد بلکہ اولاد در اولاد کو نہیں بھولتا۔ یہ اس کا المیہ بھی ہے اور طربیہ بھی۔ المیہ اس لیے کہ جوں جوں رشتوں میں پھیلاؤ ہوتا چلا جاتا ہے۔ توں توں اس کی پریشانیوں، غموں اور فرائض میں بھی اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ بعض اوقات تو انسان کو اتنی لمبی عمر عطا ہوتی ہے کہ وہ پڑپوتوں اور پڑدوہتوں تک جا پہنچتا ہے۔ اگرچہ پنجابی ضرب المثل کے مطابق ''پڑپیا ساک گیا۔'' تاہم پَڑ بھی بہت پیارا ہوتا ہے۔ میری والدہ محترمہ کہ ماشاء اللہ تادم تحریر حیات ہیں۔ انہیں اپنے پڑپوتوں اور پڑدوہتوں کا بھی بہت خیال رہتا ہے۔ طربیہ اس لیے کہ رشتوں کے پھیلاؤ کے ساتھ ساتھ محبت کی حدود بھی وسیع تر ہوتی رہتی ہیں اور لمبی زندگی میں جینے کی لذت باقی رہتی ہے۔

جب میں برسرِ ملازمت تھا تو سارے بیٹے میرے پاس رہتے تھے۔

اپریل 1983ء کے پہلے ہفتے تک ہم سب پونچھ ہاؤس سٹاف کالونی مکان نمبر A-57 میں رہتے تھے۔ 20 مئی 1983ء کو ریٹائر ہوا لیکن مکان میں نے شاید 10 اپریل کو خالی کر دیا تھا۔ اس وقت صائمہ، عظمیٰ، زہیر، سلمان اور عقیلہ میری اور اپنی دادی کی آنکھوں کی روشنی بن چکے تھے اور ہم سب اکٹھے رہتے تھے۔ اس کے بعد صغیر اور مشیر کو ستلج بلاک کے پانچ مرلے والے مکان نمبر 160 میں رہائش ملی اور میں نے اور میری بیوی نے میرے بڑے بیٹے ظہیر کے ساتھ 174، بدر بلاک میں رہائش اختیار کی۔ ظہیر اور نصیر ہم زلف ہیں یعنی دونوں میرے چھوٹے بھائی سجاد نقوی کے داماد ہیں۔ یہ مکان دونوں بھائیوں کا ہے اور مشترکہ ہے۔ پھر نصیر عباس کو سعودی عرب میں ملازمت مل گئی (وہ انجینئر ہے) اب وہ مکے میں ملازمت کر رہا ہے اور اُس کے بچے اس کے ساتھ ہیں۔ ہم میاں بیوی بھی مارچ اپریل 1985ء میں نصیر عباس کے مکہ المکرّمہ میں قیام کے باعث ہی عمرے کی سعادت سے بہرہ ور ہوئے۔ اس کی روداد ''ارض تمنا'' کے عنوان سے ''اوراق'' میں چھپ چکی ہے اور اب یکجا ہو کر کتابی صورت میں بھی فیروز سنز لاہور والوں کی طرف سے شائع ہوگی (انشاءاللہ)۔

عزیزم ظہیر الحسن کی اولاد کو ہماری محبتوں سے زیادہ بہرہ یاب ہونے کا موقع ملا ہے اور قنبر عباس نے تو ان محبتوں میں اپنے جائز حق سے بھی زیادہ حصہ پایا ہے۔ ہوا یوں کہ میری بڑی بہو تطہیر صادقہ (جو میری بھتیجی بھی ہے۔) نے دسمبر 1984ء میں یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ بھی ملازمت کرے گی۔ 1973ء میں اس نے بی۔ ایڈ کیا تھا۔ قنبر عباس آٹھ نو ماہ کا تھا کہ اس کی تقرری کے آرڈر ہوئے۔ ان دنوں قنبر کی دادی بیمار تھیں اور صاحبِ فراش۔ میری والدہ بھی یہیں تھیں اور وہ بھی بستر پر ہی رہتیں۔ ان سب میں میں ہی دمے کے باوجود کچھ توانا و تندرست تھا۔ چنانچہ اس وقت سے لے کر اب تک قنبر میرا ساتھی ہے۔ میں اس کی خدمت کرتا ہوں، وہ میرا دل بہلاتا ہے لیکن اس کی اس

رفاقت نے میری دوسری مصروفیات پر بہت پابندی لگا دی ہے۔ میں کہیں باہر نہیں جاسکتا۔ اس کی دادی کو ستلج بلاک والوں نے اُچک لیا ہے۔ وہاں صغیر کی بیوی میری بہو نسرین اور مشیر کی غیر حاضری میں اُس کی بیوی طیبہ کی دیکھ بھال ان کے سپرد ہے۔ نسرین شاہدرہ ٹاؤن میں پڑھاتی ہیں اور چھوٹا بیٹا میثم رضا اپنی دادی کے پاس رہتا ہے۔ وہ اکثر بیمار رہتی ہیں۔ ان دنوں کچھ آرام سے ہیں گیس اور تیزابیت اور شوگر نے اُن میں کچھ نہیں چھوڑا تاہم گذشتہ 47 (سینتالیس سال) کی مسلسل رفاقت (بیماری اور صحت دونوں میں) ان پوتوں کی وجہ سے ٹوٹ گئی ہے۔ اگرچہ ستلج بلاک یہاں سے بمشکل ایک میل کے فاصلے پر ہے لیکن میں 'اُن' سے ملنے کے لیے صرف جمعے کے روز جاسکتا ہوں جب ظہیر اور تطہیر کو چھٹی ہوتی ہے۔

قنبر بہت ذہن بچہ ہے۔ بچے جتنے زیادہ ذہین ہوتے ہیں، اتنے ہی زیادہ تنگ بھی کرتے ہیں۔ اُس کی فطرت میں کچھ باتیں بہت ہی عجیب وغریب ہیں:

1. ٹیلی ویژن پر ایک سال کی عمر سے لے کر اب تک اذان بہت غور سے سنتا ہے۔ ٹیلی ویژن پر اذان لگے تو جہاں کہیں بھی ہو دوڑتا ہوا آتا ہے اور صوفے پر یا فرش پر بیٹھ کر اس توجہ سے اذان سنتا ہے جیسے مراقبے میں چلا گیا ہو۔ اُس وقت کوئی چیز اس کی توجہ میں خلل انداز نہیں ہوسکتی۔
2. کھلونوں میں صرف 'کار' پسند ہے اور وہ بھی دو روپے والی۔ ہر روز ریڑھی والے سے ایک کار خریدتا ہے۔ بہت سی کاروں کے نام اسے یاد ہیں۔ اس کا چچا اس کے لیے مکے سے دو قیمتی کاریں لایا لیکن ان کو اس بے دردی سے توڑ پھوڑ دیا کہ خدا کی پناہ اس سالگرہ پر میں نے اسے بڑی سی جیپ لے کر دی ہے۔ اسے توڑنے کی کوشش میں مصروف ہے۔
3. ظہیر کے پاس ایک پرانی سی ٹیوٹا کرولا ہے جس پر وہ بچوں کو تطہیر کو اسکول چھوڑ کر آتا ہے۔ جاڑا ہو یا کڑاکے کی گرمی وہ صبح کے وقت اس سیر کا لطف

ضرور اٹھاتا ہے۔ ظہیر کار بیچنا چاہتا ہے کہ اس کے پٹرول کا خرچ پورا نہیں ہوتا لیکن قنبر کی اس عجیب وغریب ہابی کی وجہ سے نہیں بیچتا۔

4. ٹیلی ویژن کے اشتہارات بڑے غور سے دیکھتا ہے۔LIPTON کا اشتہار اخبار میں چھپتا ہے تو دو سال کی عمر سے فوراً پہچان لیتا ہے کہ لپٹن ہے۔

5. فیروز سنز کے رنگین قاعدوں سے اردو اور انگریزی کے اکثر حروف تہجی کی اسے پہچان ہوچکی ہے لیکن کسی کی فرمائش پر سناتا نہیں۔ اس سے بہت الرجک ہے۔

6. ضد بہت کرتا ہے لیکن میں زیادہ ناراض ہو جاؤں، تو اس کا احساس بھی اسے ہوتا ہے۔ پھر میری داڑھی پر ہاتھ پھیرتا ہے اور خوشامد کر کے مجھے مناتا ہے۔

اچھا! جو کچھ دیا، اُسے نے دیا ہے
اُس کا جتنا بھی شکر ادا کیا جائے، کم ہے
درود ہو محمدؐ وآل محمدؐ پر کہ جو ملا اُن کے طفیل ملا

خدایا! مجھے ایمان کی دولت عطا فرما۔ اولاد کی محبت کو میرے لیے فتنہ قرار نہ دینا۔ میں تو معمولی سے امتحان میں فیل ہو جاتا ہوں۔ آلِ محمدؐ کی سی آزمائش مجھ پر نہ ڈالنا۔ یہ آزمائشیں انہیں کو زیب دیتی ہیں۔

یا اللہ! آزمائش سے بھی اور فتنہ وآشوب زمانہ سے بھی محفوظ فرما۔

آمین! جو اولاد عطا کی ہے، اسے ہر بلا سے محفوظ و معون فرما۔ آمین ثم آمین۔

دنیا کی بے ثباتی

3 جون 1987ء

آج جب میں یہ سطور لکھ رہا ہوں، میری عمر کا پینسٹھواں سال جا رہا ہے۔ جوں جوں عمر بڑھ رہی ہے، زندگی کی بے معنویت کا احساس شدید سے شدید تر ہو رہا ہے۔ کائنات، اس کی وسعت اور اس کے اسرار پر غور کرتا ہوں، تو ایک عجیب سی کیفیت میں ڈوب جاتا ہوں جیسے دمے کا دورہ بھی پڑا ہو اور انسان گہرے سمندر کی طوفانی لہروں میں ڈوب رہا ہو اور دم گھٹ رہا ہو اس کے باوجود لہروں کی فولادی گرفت سے مصروف پیکار ہونے پر مجبور ہوں۔ میرا ذہن فلسفیانہ نہیں، اس لیے میری سوچ بھی جذباتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ کسی فیصلے پر نہیں پہنچ سکا۔ پانچ وقت کی نمازیں پریشان خیالی کا شکار ہیں کوئی خواب بھی دکھائی نہیں دیتا جس میں کچھ معنویت ہو۔ کچھ خواب خوفناک بھی ہوتے ہیں۔ موت کو کشادہ دلی یا گرم جوشی سے قبول کرنے کے لیے ''آمادگی'' یا ''خودسپردگی'' کی کیفیت بھی تا حال پیدا نہیں ہوئی لیکن اتنا یقین ضرور ہوگیا ہے کہ جوں جوں عمر بڑھتی چلی جائے اثبات کی منزل سے توں توں دوری بھی ہوتی چلی جائے گی۔ اب موت ہی بہتر ہے۔ وہ جو تحفظ کا احساس ہوتا ہے، اس کی بجائے خوف طاری ہے۔ جن سے محبت ہے، ان کا دائرہ وسیع ہو رہا ہے۔ ان کے لیے دعائیں مانگتے نہیں تھکتا۔

بے معنی موت (Absurd Death)

17 جولائی 1987ء

5 جولائی کو لاہور ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم نمبر 2 اور سٹیشن سے باہر بم کے دھماکے ہوئے جن میں چھ بے گناہ اور معصوم انسانوں کے پرخچے اڑ گئے۔ ان میں دو خوبصورت بچے بھی شامل تھے۔ یہ فوری طور پر جاں بحق ہوئے اور ان کی ماں زخمی ہو کر ہسپتال پہنچی اور دو چار روز بعد اپنے بچوں سے جاملی۔ ایک عورت اُس بنچ پر بیٹھی تھی جس پر ٹائم بم دھرا تھا۔ اس عورت کا اوپر کا دھڑ پرُزے پرُزے ہو کر اڑ گیا۔ ان ٹکڑوں کو اکٹھا بھی کیا گیا لیکن ان سے مردہ عورت کے بے جان وجود کی تصویر مکمل نہ ہو سکی۔ نہ معلوم یہ عورت کون تھی؟

اُسی شام یہ خبر نشر ہوئی تو یوں لگا جیسے میرے وجود کے پرخچے اڑ گئے ہوں۔ اگلے دن 6 جولائی کو صبح کو اخبار پڑھنے کے بعد میں نے ایک خط اخبار جنگ کے کالم نویس منو بھائی کو لکھا۔ ان کے کالم کا نام گریبان ہے، میں نے لکھا تھا کہ خط اپنے کالم میں شائع کریں۔ کالموں میں منیر احمد قریشی عرف منو بھائی یہ تاثر دیتے ہیں کہ وہ نہایت بے باک، حق گو اور غیر جانبدار کالم نویس ہیں۔ کچھ انہیں سوشلسٹ ہونے کا دعویٰ بھی ہے جس کا اظہار ان کے کالموں میں ظاہر باہر تو نہیں، بین السطور میں ہوتا ہے۔ مشہور نام نہاد ترقی پسند ادیب احمد ندیم قاسمی سے بھی عقیدت کا اظہار کرتے ہیں۔ بہرحال اس بے باک کالم نویس نے اس خط کو شائع نہیں کیا۔ میں اس خط کو ان صفحوں پر نقل کرتا ہوں۔

لاہور 6 جولائی 1987ء منو بھائی

تسلیم! یہ پارا چنار، پنڈی، پشاور اور لاہور میں جب کوئی بم پھٹتا ہے تو یوں لگتا ہے جیسے میرے پرخچے اڑ گئے ہوں۔ ایک مدت بعد جب میں بکھرے ہوئے

پرزوں کو جوڑ کر دوبارہ اپنے وجود میں آتا ہوں، تو ایسا خوفزدہ ہو جاتا ہوں کہ میری راتوں کی نیند اُڑ جاتی ہے۔ میرے بیٹے، بیٹیاں، پوتے، دوہتے میرے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور کہتے ہیں ''بابا جان! ہمیں اس بے معنی موت کے خوف سے بچایئے۔'' میں بے چینی سے ان کا منہ تکتا رہتا ہوں کہ اس خوف کے ازالے کے لیے کوئی فلسفہ آڑے نہیں آتا۔

1947ء کے قیامت خیز دنوں میں موت کی بہت ارزانی تھی لیکن میں خوفزدہ نہ ہوا۔

1965ء میں مجھے اپنا گاؤں خالی کرنا پڑا اور لاہور کی فضاؤں میں میں نے زندگی اور موت کو دست وگریباں دیکھا لیکن میں خوفزدہ نہ ہوا۔

1971ء میں میں شکست کی ذلت سے دوچار ہوا اور دشمن کے ہوائی جہاز آسمان سے آگ برساتے رہے لیکن میں خوفزدہ نہ ہوا۔

لیکن اب جب سے موت کے یہ نامعلوم پروانے میرے نام آنے لگے ہیں، میں اندر سے ٹوٹ پھوٹ گیا ہوں۔ میں پینسٹھ سال کی عمر میں بھی اس بے مقصد، لایعنی (absurd) اور احمقانہ موت کے لیے اپنے آپ کو تیار نہیں پا رہا۔

یہ بم افغان مہاجرین کی بستیوں پر چلیں تو مجھے دکھ ضرور ہو گا لیکن میں انہیں قبول کر لوں گا کہ اس صورت میں موت ان کے لیے بامعنی ہے۔ انہوں نے ایک نظام زندگی سے بغاوت کی ہے۔ یہ موت اُن کے لیے شہید کی موت ہے۔

یہ بم کارمل اور نجیب اللہ کے پرخچے اُڑا دیں تو میں انہیں بامقصد کہوں گا کیونکہ کارمل اور سب کو اپنے نظریے کا شہید کہلانے کی سعادت حاصل ہو جائے گی۔

یہ بم ریگن اور گورباچوف کے لیے موت کا پیغام بر بنیں اور اُن کے بیوی بچوں کے کٹے ہوئے اعضا دور دور تک بکھر جائیں تو موت اُن دونوں کے لیے بامعنی ہو گی۔ کیونکہ انہیں اپنے اپنے نظریات زندگی کی صداقت پر ''حق الیقین'' حاصل ہے۔

وہ لوگ جو دو سوپر طاقتوں کی نظریاتی جنگ ہم پر مسلط کرنے کے مجرم بنے ہیں، یہ بم ان پر گریں تو ان کی موت بھی با مقصد کہلائے گی کیونکہ وہ اپنے اقتدار کو دوام بخش سکیں گے۔

ارباب اقتدار سے استدعا ہے کہ مجھے اس ذلت کی موت سے بچائیں یا میرے ہاتھ میں کسی مقصد یا معنی کی کلاشنکوف تھما کر کہیں کہ جاؤ محاذ پر جا کر لڑو۔

میں اس کے لیے بخوشی تیار ہوں۔ کیونکہ ''مقصد'' انسان کا سب سے بڑا دفاع ہے۔اس فصیل کی اوٹ میں موت بھی آئے تو وہ مومن کی موت ہوتی ہے اور مومن ایسی موت کو''تبسم برلب'' قبول کرتا ہے۔

بلاشبہ ایسی ہی موت زندگی کو با معنی بناتی ہے۔

خوف کا مارا ہوا

ایک پاکستانی

غلام الثقلین نقوی

پس نامہ: یہ خط میں نے آپ کے کالم کے لیے لکھا ہے۔

اس قیامت خیز حادثے کے بعد صدر، وزیراعظم اور دوسرے وزیر و وزرا زخمیوں کی عیادت کے لیے ہسپتال پہنچے۔ زخمیوں کو طفل تسلیوں سے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ وہ لوگ جو بغیر کسی جرم کے اس ظلم کا شکار ہوئے ہیں۔ بھلا کیا مطمئن ہوتے۔ صدر محترم نے اخبار نویسوں کو جو انٹرویو دیا۔ اس میں ایک جملے نے مجھے بہت دکھ دیا۔ فرمایا''لوگوں کے حوصلے بلند ہیں۔''

پتہ نہیں صدر صاحب یا تو بہت ہی سادہ لوح ہیں یا بہت ہی زیادہ عیار کہ ایسا دل دکھانے والا جملہ کہنے کی جرأت انہیں ہوئی۔ میں بھی تو ''لوگوں'' میں شامل ہوں، میرے تو حوصلے قطعاً بلند نہیں ہیں بلکہ اتنے پست ہو چکے ہیں کہ اسفل السافلین کی حد تک پہنچ گئے ہیں۔

ابھی اس دھماکے کی گونج دل و دماغ کو لرزا، کپکپا رہی تھی کہ 14 جولائی کو کراچی صدر کے بارونق بازاروں میں قیامت خیز بم چل گئے اور میرا وجود پھر پرزے پرزے ہوگئے۔

ستر کے قریب بے گناہ لوگ جو بازار میں خرید وفروخت کو آئے تھے، ڈھیر ہوگئے۔ ان میں بچے بھی تھے، جوان بھی تھے اور بوڑھے بھی۔ عورتیں بھی یقیناً ہوں گی۔ جن لوگوں کی سالم لاشیں مل گئیں ان کی شناخت ہوگئی۔ کچھ وہ تھے جو دھماکے اور دھویں میں تحلیل ہوگئے اور جل کر کوئلہ بن گئے۔ کچھ وہ تھے جن کے پرزے اُڑ کر چوتھی منزل کی چھت پر جا گرے۔ ان لوتھڑوں کو اکٹھا کیا گیا لیکن آج کوئی ابراہیم علیہ السلام بھی تو نہیں کہ جس کی درخواست پر قدرت ان پرزوں کو اکٹھا کر کے انسانی شکلوں اور جسموں میں لاکر ''احسن التقویم'' کا درجہ دے سکے۔ ایک نوجوان کا کٹا ہوا سر ملا تو گویا یزیدی سنت بھی پوری ہوگئی۔

جن لوگوں نے یہ بم چلایا، ان کی شقاوت مسلّم لیکن جن لوگوں کے پُرزے اُڑے، ان کی ناگہانی موت کو آپ کیا نام دیں گے۔ کیا انہوں نے اس قسم کی موت کی تمنا کی تھی۔ یا انہیں وہم و خیال بھی تھا کی ایسی ذلیل کن موت ان کی قسمت میں لکھی ہے۔ کیا وہ اس بازار میں مرنے کو آئے تھے۔ ایسی ''لایعنی'' موت کو گلے لگانے کے لیے...... موت اٹل ہے۔ اس زہر ہلاہل کو انسان نے کچھ میٹھے نام بھی دیے ہیں تاکہ اس کی تلخی میں شدت کم ہو۔ جو لوگ اپنی طبعی عمر پوری کر کے مرتے ہیں، وہ اس خیال سے موت کی کرواہٹ کو چکھتے ہیں کے آخر ہم نے اپنی عمر پوری کر لی۔ زندگی کے تلخ و شیریں کا مزہ اٹھالیا۔ جو لوگ میدان جنگ میں جا کر مرتے ہیں۔ انہیں بھی ایک اطمینان ہوتا ہے کہ ہم اپنے مذہب، ملک یا قوم کے لیے جان دے رہے ہیں اور ہم شہید ہیں۔ جو لوگ کسی نظریے کی خاطر جان دیتے ہیں، وہ بھی ہنسی خوشی موت کو قبول کر لیتے ہیں بلکہ یہ بھی ایک قسم کی شہادت ہے۔

اگر پاکستان اور افغانستان میں باقاعدہ جنگ چھڑی ہو اور آسمان سے بم برس رہے ہوں تو میں یہ نہیں کہتا کہ جس کے ٹکڑے اُڑیں گے، وہ اس موت کو خندہ پیشانی سے گلے لگا رہا ہے لیکن موت اس کی بھی بے معنی نہیں ہوگی۔ ایران عراق جنگ میں لاکھوں لوگ ہلاک ہوگئے۔ ''ایرانی'' تو جذبۂ شہادت سے سرشار ہیں۔ اس لیے ان کی موت تو ایک بشارت ہے۔ ایک ابدی زندگی کی نہایت بامعنی موت ہے۔ وہ عراقی جو صدام سے نظریاتی اختلاف کے باوجود لڑنے اور مرنے پر مجبور ہے اس کی موت بھی ''لایعنی'' نہیں کہ وہ بھی ایک نظریے کی حفاظت میں جان دے رہا ہے۔

لیکن دہشت گردوں کے بموں سے جن کے ٹکڑے اڑتے ہیں ان کی موت بے معنی ہی نہیں، احمقانہ بھی ہے۔ وہ سال ڈیڑھ سال کی بچی جو ایک کار میں جل کر کوئلہ ہوگئی، کیا اس کی موت ''حوصلہ افزا'' تھی۔

ایسی مرگ انبوہ پر تو ''جشن'' کا گمان بھی نہیں ہوتا۔

اس مرگ انبوہ کے بعد لوگوں نے جشن بھی منایا، اس کے بھی دو پہلو ہیں۔

ایک پہلو تو یہ کو نوجوان خون دینے کے لیے امڈ آئے۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ تباہ شدہ دکانوں اور مکانوں میں خوب لوٹ مار مچی۔

ایک عورت کی تصویر اخبار میں چھپی ہے جو صدر محترم سے شکایت کر رہی ہے کہ اس کے گھر کو بم کے دھماکے سے بہت نقصان پہنچا اور جب وہ گھر چھوڑ کر باہر نکلی تو اس کی غیر حاضری میں لوگوں نے اس کا گھر لوٹ لیا۔ اس لوٹ میں اس کی دو بچیوں کا جہیز بھی شامل تھا۔

''ایدھی ٹرسٹ'' والے مولانا عبدالستار ایدھی اور ان کی بیگم کی خدمات حیران کن طور پر قابل داد ہیں۔ پاکستان میں شاید صرف یہی ایک ادارہ ہے جو کسی ذاتی منفعت کے بغیر انسان کی خدمت کرتا ہے۔ ان دو ''انسانوں'' کے لیے زندگی واقعی ''بامعنی'' ہے۔ اللہ! انہیں جزائے خیر دے۔ ایسے انسان زندگی پر ایمان کو بحال کرنے

میں ایک مینارۂ نور کا کام دیتے ہیں۔

یہ خط منو بھائی نے اپنے کالم میں شائع نہیں کیا۔

10 محرم الحرام 1408ھ بمطابق 4 ستمبر 1987ء

زندگی کے پینسٹھویں سال کا عشرہ محرم بھی گزر گیا یا آج رات 'شام غریباں' کی مجلس کے بعد گزر جائے گا۔

آج ارادہ تو ہے کہ نیلا گنبد میں شجر ہاؤس والی مجلس کا کچھ حصہ سنا جائے۔ پھر عصر کے وقت ایبٹ روڈ پر امام بارگاہ گلستانِ زہرا علیہا السلام میں اس تسبیح کی زیارت کی جائیے جس کے کچھ دانے ظہر اور عصر کے درمیان خون کے قطروں کی طرح سرخ ہو جاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اس تسبیح میں تین یا پانچ دانے ہیں جو قطرہ ہائے خون بن جاتے ہیں۔ اس امام بارگاہ کا نوجوان متولی اس تسبیح کو ہاتھ میں لے کر ایک اونچے میز پر کھڑا ہو جاتا ہے۔ خود بھی بہت روتا ہے اور دوسروں کو بھی رلاتا ہے۔ تقریباً ہر سال ان سرخ دانوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ واقعی تازہ اور جوش مارتے ہوئے لہو کے آنسو معلوم ہوتے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ تسبیح کی آنکھ سے ابھی ٹپک جائیں گے رات کو مجلس شام غریباں ٹی وی سے سنوں گا اور پھر سو جاؤں گا۔

لیکن اس رات کا بھیانک تصور ساتھ لے کر سوؤں گا، جو تنہائی اور غم کی ایک ایسی علامت ہے کہ جس کی نظیر تاریخ کا کوئی صفحہ پیش نہیں کر سکتا۔ بیابان، جلے ہوئے خیمے، بے کسی، بے بسی، مقتل میں گھوڑوں کے سموں سے روندی ہوئی بے سر لاشیں۔ چند بچے، کچھ مستورات، ایک مرد جو کہ اس لٹے ہوئے قافلے کا سالار ہے۔ حضرت حرؓ (شہید) کی نیک دل بیوی جو پانی اور کھانا لے کر آئی ہے لیکن تین روز کے پیاسے بچے بھی کہ جن کے حلق میں کانٹے پڑے ہیں۔ اس پانی اور کھانے کو آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتے۔ آخر حضرت زینب سلام علیہا کے کہنے پر بچے کوزوں میں پانی لیتے ہیں اور ایک

تین سال کی بچی کوزہ بھر کر مقتل کی طرف بھاگتی ہے۔ ایک خاتون اسے لپک کر تھام لیتی ہیں اور پوچھتی ہیں ''کہاں جاری ہو سکینہ؟''

اپنے ابو کے پاس انہیں پانی پلاؤں گی، وہ بھی تو تین دن کے پیاسے ہیں۔

اس رات کے ساتھ وابستہ سارے مناظر میری نگاہوں میں پھرتے رہیں گے لیکن میں پھر بھی سو جاؤں گا۔ ذاکر نے اس رات کی بھیانک ویرانی کا جو نقشہ کھینچا تھا، اسے دماغ پر مرتسم کر کے سو جاؤں گا۔ تھکا ہوا ذاکر بھی سو جائے گا۔ ممکن ہے یتیم، بے آسرا بچے جنہوں نے خون آشام ظہر اور عصر کے درمیان کی چند ساعتوں کا لہو رنگ منظر دیکھا تھا۔ وہ بھی سو جائیں۔ ممکن ہے کہ سید سجاد غش کی حالت میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جائیں کہ گیارھویں محرم سے ان کے صبر و رضا کا جو امتحان ہونا ہے، اس کی تیاری کے لیے دو چار ساعتوں کا آرام حاصل کر لیں (قدرت کو بھی یہی منظور تھا ورنہ وہ جوان جو دسویں محرم کو بیماری کی وجہ سے بستر سے اٹھ نہیں سکتا تھا۔ گیارھویں محرم کی صبح کو قافلے کے سب سے اگلے اونٹ کی مہار تھام کر اور زنجیریں پہن کر کوفہ و شام کے دور دراز سفر پر روانہ کیسے ہو سکتا) بڑا امکان ہے کہ ام کلثومؑ، ام ربابؑ، ام فروہؑ، رقیہؑ، فاطمہ کبریٰؑ اور اصحابِ حسینؑ کی بیویوںؓ کی آنکھ بھی جھپک گئی ہو لیکن ایک خاتون ہیں کہ صبر و رضا کا پہاڑ بن کر اپنے مقام پر کھڑی ہیں کہ نیند ان سے کوسوں دور بھاگ رہی ہیں اور یہ خاتونؑ ہیں حضرت زینبؑ (میرے ماں باپ اُن پر فدا) جو وہ مسلسل جاگ رہی ہیں۔ لیکن میں پھر بھی سو جاؤں گا۔

مجھے اس نیند پر ہمیشہ پچھتاوا ہوا۔ میں اس محترم مقام خاتونؑ سے ہر محرم کو شرمندہ ہوا کہ میں ایک رات کی نیند کی قربانی بھی نہ دے سکا۔ پھر ان کے ساتھ دعویٰ خلوص کے کیا معنیٰ؟

ظہر اور عصر کے درمیان جو ایک دو ساعتیں ہیں، وہ اکسٹھ ہجری کے دس محرم کو گردش زماں و مکاں سے علیحدہ ہو کر اپنا سیارچہ آپ بن گئیں۔ یہ دنیا اربوں اور

کھربوں ساعتوں کی گردش سے وجود میں آئی۔ اس میں ایک دو ساعتوں کی کیا حقیقت لیکن میرے لیے یہ ایک دو ساعتیں ایک پوری دنیا ہیں۔ ان میں انسانی شرف وعزت اور انسانی پستی و ذلت کی ہر داستان محفوظ ہو کر رہ گئی۔ ایک طرف صبر و رضا، استقلال و پامردی، خلوص و مروت، جاں نثاری وجاں سپردگی عزیمت و ثبات، قربانی و ایثار کی داستانیں تخلیق ہوئیں۔ تو دوسری طرف ظلم وستم، شقاوت و بربریت، بے وفائی و وعدہ خلافی کی کہانیاں ایجاد ہوئیں۔

شب عاشور جب امام حسین علیہ السلام نے چراغ بجھا کر اپنے اصحاب اور اعزأ و اقربا سے کہا کہ جس کا جی چاہے، وہ اپنی جان بچا کر لے جائے۔ میں نے اپنی بیت کا قلاوہ تمہاری گردنوں سے اتار لیا ہے۔ اس پر گریہ و بکا کی آواز بلند ہوئی۔ جب چراغ دوبارہ روشن ہوا تو ایک بھی پیکر صدق وفا کی کمی نہ ہوئی۔ حبیب ابن مظاہرؓ نے فرمایا ''یا ابن رسول اللہ خدا مجھے سات بار مار کر بھی زندہ کرے تو ساتوں بار میں اپنا سر آپ کی خاطر قربان کرنے سے دریغ نہیں کروں گا۔''

حبیب ابن مظاہرؓ کوفے کے رہنے والے تھے۔ انہیں امام حسین علیہ السلام سے عقیدت تھی لیکن یہ لشکر یزید میں شامل نہیں ہوئے تھے۔ امام حسین علیہ السلام نے انہیں اور صرف انہیں اپنی نصرت کا پیغام بھیجا تھا۔ وہ چھپ چھپا کر فوج حسین میں شامل ہوئے تھے اور دوسری طرف لشکر یزید میں اکثر وہ لوگ موجود تھے جنہوں نے خط پہ خط لکھے کے امامؑ کوفے آئیں اور ایک طاغوتی طاقت کے خلاف ان کی راہنمائی کریں۔ ان کے خطوط امامؑ کے لیے حجت بن گئے اور یہ صاحبان دجل وفریب اپنے وعدے سے پھر گئے۔

زہیرؓ ابن قین اور مسلمؓ بن عوسجہ اتنے بوڑھے تھے کہ ان کی سفید بھویں ان کی آنکھوں پر آپڑتی تھیں اور ان کی شمشیرزنی اور تیراندازی میں فرق آتا تھا۔ ان بزرگوں نے بھنوؤں کے بال دھاگوں کے ساتھ اپنے سر کے بالوں سے باندھ دیے کہ بھنویں کسی

رہیں۔

ان میں سے کچھ اصحابؓ وہ تھے کہ ظہر کی نماز میں امام حسین علیہ السلام کے آگے سپر بن کر کھڑے ہوگئے۔ دشمن نے تیر برسائے تو اپنے جسموں پر لیے اور شہادت کے درجے پر فائز ہوگئے۔ ایک شہید کا نام جونؓ تھا(John) جو حضرت عمارؓ یاسر کے آزاد کردہ حبشی غلام تھے۔ آپ نے اذن جہاد مانگا تو کسی مصلحت کی بنا پر امامؑ نے انکار فرما دیا۔ اس پر وہ بزرگ رونے لگے۔ پھر کہا اے امامؑ؛ مجھے اس لئے اجازت نہیں مل رہی کہ میں حبشی ہوں اور میرا خون بدبودار ہے امامؑ نے انہیں اجازت دے دی۔ جب وہ زخمی ہوکر میدان جنگ میں گر پڑے تو امامؑ ان کے سرہانے پہنچے اور ان کا سر گود میں لے کر ان کے چہرے سے خاک وخون صاف کیا اور فرمایا ''جون! مجھے تو تیرے لہو سے جنت کی خوشبو آرہی ہے۔''

روایت ہے کہ جب تک حضرت جونؓ کی لاش مقتل میں بے گوروکفن پڑی رہی، اس سے خوشبو آتی رہی۔

اس لشکر میں حضرت حرؓ کا شامل ہونا بھی، ایک ایسی داستان ہے کہ جس کی نظیر تاریخ انسانیت میں نہیں ملتی۔ وہ ایک ہزار فوج کے دستے کے سردار تھے۔ امام عالی مقامؑ کو انہوں نے مجبور کیا تھا کہ وہ نہر فرات سے ہٹ کر خیمے لگائیں عشرہ محرم کی صبح وہ یزیدی فوج سے نکلے اور حسینی فوج میں آشامل ہوئے۔ اتنا عظیم فیصلہ حرؓ جیسے مرد جری و حق شناس ہی کر سکتے تھے۔ وہ مختصر سی فوج جس کی تعداد ''یزدان'' کی ہم عدد یعنی بہتر ہو اور جس کے مقابلے میں اتنی فوج کھڑی ہو کہ وہ ریگِ دشت کی طرح لاتعداد ہو، اس میں شامل ہونا گویا اپنا سر خود کاٹ کر ہتھیلی پر رکھ لینے کے مترادف تھا۔ حضرت حرؓ کو یہ اعزاز حاصل ہوا کہ وہ شہیدوں میں پہلے نمبر پر میدان میں گئے۔

لشکر حسینی کے ہر فرد نے ایک نئی داستان شجاعت تخلیق کی۔

اس لشکر کے بچے ہتھیار بند ہوتے وقت اتنے خوش ہوتے جیسے نئے کپڑے

پہن کر عید گاہ کی طرف جا رہے ہوں۔ یہی کیفیت تیرہ سالہ قاسمؑ کے چہرے بشرے سے عیاں تھی۔ ان کی والدہ محترمہ اُم فروہؓ نے انہیں بنا سنوار کر امام کے حضور میں پیش کیا۔ امامؑ نے دل پر پتھر رکھ کر انہیں اذن جہاد دیا تھا۔ خود گھوڑے پر سوار کرایا۔ اس مجاہد کا جو حلیہ حمید بن مسلم نے بیان کیا، ''حلیہ نویسی'' کا شاہکار ہے۔ میں اس کا مفہوم لکھ رہا ہوں ''آپ کے جو مبارز میدان میں آیا'' تیرہ سال کا ایک بچہ تھا کہ پیشانی اس کی چودھویں کے چاند کی مانند چمک رہی تھی اور اس کے پاؤں رکابوں میں نہیں پہنچ رہے تھے۔ ایک نعل کا تسمہ ٹوٹا ہوا تھا۔ یہ بچہ اس جوش سے یزیدی فوج پر حملہ آور ہوا کہ بڑے بڑے جنگجو اس کے سامنے سے ہٹ گئے۔''

اس بچے نے جام شہادت نوش کیا تو امام عالی مقام اس کی لاش کو خیمے تک لانے کے لیے میدان میں پہنچے تو بقول ذاکر ریت پر سے پھول چننے لگے۔ بلکہ یہ کہوں گا کہ پتیاں اکٹھی کر کے پھول کی تخلیق کرنے لگے۔

بہتر شہیدوں میں ایک شہید کی عمر چھ مہینے کی تھی۔

اس شہید کے گلے میں جو تیر لگا تھا، وہ تین پھلوں کا تھا۔

اور سب سے آخر میں میں اس مائیؑ کا ذکر کروں گا جس کا بھرا پڑا باغ اس کی نظروں کے سامنے اجڑ گیا تھا، لیکن اس کے پائے ثبات میں لغزش نہ آئی تھی۔

سن اکسٹھ ہجری کی دسویں محرم کو اس عظیم انسان کی عمر اٹھاون سال قمری تھی۔ اتنا پڑھنے اور سننے کے بعد میرے تخیل میں اس بطل عظیم کی جو تصویر نقش پذیر ہوئی ہے۔ اس کی تفصیل کچھ یوں ہے۔ چھریرا بدن اوسط سے کچھ نکلتا ہوا قد۔ نہ لمبا نہ چھوٹا چہرہ آفتاب کی طرح روشن بڑی بڑی آنکھوں میں چاند اور ستارے بسے ہوئے۔ اپنے نانا ﷺ کی طرح واللّیل کی سیاہ زلفیں دونوں کندھوں پر پڑی ہوئیں۔ نہایت خوش لباس جامہ زیب۔ روایت ہے اللہ کے حضور میں پیش ہوئے تو نہایت نفیس لباس پہن کر۔ لباس اور جسم مبارک سے مشک و گلاب کی لپٹیں آتی ہوئیں کہ مشام میں جنگ

الفردوس کی خوشبوئیں بس جائیں۔ پیشانی پر اثر السجود۔ قائم واللّیل اور صائم الدہر ہونے کے باوجود چہرے پر خشونت کی رمق بھی نہیں۔ نہایت کھلا، صاف اور بے ریا چہرہ کہ جسے دیکھ کر یوں لگے جیسے قرآن کا کوئی ورق کھل گیا ہو۔ ریش مبارک کے بالوں میں ظہر تک سیاہی کا غلبہ عصر کے وقت جب سب جاں نثار راہی جنت ہوگئے اور حضرت علی اصغرؑ پیاس کی شدت سے تڑپنے لگے اور حرملہ کے تیر نے ان کی پیاس بجھا دی تو ریش مبارک میں ایک سیاہ بال بھی باقی نہ رہا۔ روایت ہے کہ حضرت علی اصغرؑ کے خشک حلق سے جو لہو بہا، وہ امامؑ عالی مقام نے اپنی ہتھیلیوں میں لیا اور پہلی بار ڈاڑھی پر اس سے خضاب کیا کہ کمر میں ہلکا سا خم بھی نہیں تھا لیکن جب سرکار وفا حضرت عباسؑ علمبردار شہید ہوئے تو کمر جھک گئی۔ زرہ پہننے سے پہلے کمر میں پٹکا باندھا کہ جسم تنا رہے اور کسی کافر کو گماں نہ گزرے کہ منزل عشق کی کسی کڑی صعوبت نے صبر و رضا کی کمر جھکا دی ہے۔ وہ عابد و زاہد جو ہر نماز پر گھر سے نکلتا تو نفیس لباس زیب تن کر کے کہ جس ہستی کے حضور میں پیشی ہے، اس سے بڑی ہستی اور کون سی ہے اور اس سے بڑا دربار کس کا لگتا ہے لیکن آج یعنی سن اکسٹھ ہجری کی دسویں محرم کو یہی خوش لباس عابد سب سے بڑی عبادت کے لیے گھر سے نکل رہا تھا۔ تو اس نے زرہ کے نیچے ایک پرانا کرتا پہن لیا تھا اور اسے بھی جگہ جگہ سے پھاڑ دیا تھا کیونکہ اس کی فراست نے دیکھ لیا تھا کہ یہ ظلم ایجاد مسلمان جب میری لاش سے لباس اتاریں گے تو شاید .... میں اگلا جملہ نہیں لکھ سکتا.......... میرا قلم بہت غیرت مند ہے۔.......... اس کا سر شرم سے جھک گیا ہے۔..........

11 نومبر 1980ء

کربلا کی اس دو ساعتوں کی جنگ میں وفا کی جو نئی روائتیں قائم ہوئیں۔ ان کی نظیر بھی نہیں ملتی اور ظلم و انتقام کے جو نئے نئے طریقے ایجاد ہوئے، ان کی مثال بھی نہیں ملتی۔ امامؑ عالی مقام کا ہر ساتھی وفا کا مجسمہ تھا۔ ان کے خاندان کے ہر فرد نے

وفاء کشی کی ایک طرفہ داستان اپنے خون سے ریگ کربلا پر لکھی۔ کہتے ہیں کہ ریت پر لکھا ہوا مٹ جاتا ہے لیکن ان داستانوں کو وہ دوام حاصل ہوا کہ بنی امیہ اور بنی عباس کے ملعون بادشاہوں کا جبر واستبداد سے جریدہ عالم سے مٹانے میں ناکامیاب رہا۔ حضرت بریرؓ ہمدانی پانی لانے کے لیے دریا تک پہنچ گئے لیکن ایک چلو پانی خود نہ پیا کہ امامؑ کے ہونٹ خشک ہوں تو میں کیسے پانی پی سکتا ہوں۔ سرکار وفا حضرت عباسؑ بن علیؑ نے دریا سے شکیزہ بھر لیا لیکن اپنے خشک ہونٹ تر نہ کیے۔

اب میں ظلم وانتقام کی داستانوں کی طرف آتا ہوں۔

1۔ عربوں میں دشمنوں پر بھی 'پانی' بند نہیں کیا جاتا۔ اگر کسی نے ایسا کیا تو اسے تاریخ ملامت کرتی رہی۔ اس بدعت کا آغاز معاویہ نے جنگ صفین میں کیا کہ فرات کے گھاٹ پر قبضہ کرلیا اور حضرت علیؑ کی افواج کو پانی سے محروم کر دیا۔ جب افواج علیؑ نے گھاٹ پر قبضہ حاصل کیا تو حضرت علیؑ نے پانی کے معاملے میں دوست دشمن میں تمیز مٹا دی۔ کسی کو پانی سے محروم کرنا توہین انسانیت ہے۔ اس سنت قبیح کو کربلا میں زندہ کیا گیا کہ امام حسینؑ کے خیمے نہر فرات سے دور لگوائے گئے اور ساتویں محرم سے ان پر پانی بند کر دیا گیا۔ دس ہزار یزیدی فوجوں کے مقابلے میں مٹھی بھر حسینیوںؑ پر پانی بند نہ ہوتا تو کیا فرق پڑتا اور اس سنت میں نیا پن یہ پیدا کیا گیا کہ عورتوں اور بچوں کو بھی تین دن تک پانی سے محروم رکھا۔ علی اصغرؑ کے لیے امام نے پانی طلب کیا تو اسے زہر آلود تیر کا پانی پلایا گیا۔ حسینؑ اور ان کے ہمراہیوںؓ کو اس کرب واذیت کا یہ مزہ کیوں چکھایا گیا؟ کیا کوئی انسانی منطق اس کا جواز تلاش کرسکتی ہے؟

2. جب حضرت امام حسین علیہ السلام ظہر کی نماز پڑھا رہے تھے تو ان نمازیوں کی صفوں پر تیر کیوں برسائے گئے؟ ایسا تو کفار کے ساتھ کسی جنگ میں بھی نہیں ہوا تھا۔ کیا رسول خدا ﷺ کے زمانے میں نماز پڑھتے ہوئے مسلمانوں پر

کفار نے تیروں کی بارش کی؟ اور یہاں تو دونوں طرف مسلمان صف آرا تھے۔ اس غدارانہ تیراندازی کا نتیجہ یہ ہوا کہ امام کے کئی صحابیؓ سینوں کو سپر بنا کر کھڑے ہو گئے اور جام شہادت نوش کیا۔

3. تیرا سالہ مجاہد حضرت قاسم بن حسنؑ جب زخمی ہو کر گھوڑے سے گرے تو ان کی ننھی سی لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کیوں کیے گئے۔ کیا عرب زمانہ جاہلیت میں ایسا کرتے تھے؟ وہ گرے ہوئے دشمن کا سر کاٹ لیتے تھے لیکن لاش کی بے حرمتی نہیں کرتے تھے۔

4. حصین بن نمیر لعین نے حضرت علی اکبرؑ کے سینے میں برچھی ماری اور وہ گھائل ہو کر فرش زمین پر گر گئے۔ لعین نے یہ کہہ کر برچھی کی لکڑی توڑ دی کہ حسینؑ کا صبر مشہور ہے، دیکھیے بیٹے کے سینے سے پھل کیسے نکالتے ہیں۔ حسینؑ نے صبر کا یہ کرشمہ بھی دکھایا۔ جوان خون کا چشمہ ابلا اور شہید کے جسم کو خونیں کفن مل گیا۔

5. حضرت علی اصغرؑ کو تیر کیوں مارا گیا؟ چھ ماہ کے بچے اور وہ بھی خاندان رسول ﷺ کے بچے کو اس بے دردی سے ذبح کرنے کا کٹھور دل کیسے پیدا ہوا۔ یہ دل پتھر کا تھا، یا وہ سینہ پتھر کی سل تھا۔ جس میں یہ دل تھا۔ عمرو بن سعد لعین نے جو صحابی زادہ تھا، حرملہ سے کہا تھا ''حسینؑ کی تقریر کو قطع کر دو۔''

6. جنگ میں مقتول ہونے والے لوگوں کی لاشوں پر گھوڑے دوڑانے کی کوئی روایت عرب کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ جنگ جب عروج پر ہو تو زخمی یقیناً گھوڑوں کے پاؤں کے نیچے کچلے جاتے ہوں گے۔ آج کل بھی ٹینک آدمیوں کو اپنے پہیوں تلے کچل ڈالتے ہیں لیکن یہ کبھی نہیں ہوا کہ مقتولین کی لاشوں پر عمداً ٹینک چلائے گئے ہوں۔ یہ ظلم بھی مسلمانوں کی ایجاد ہے اور اللہ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ اس 'نیک' روایت پر کسی کافر فوج نے بھی عمل نہیں کیا۔

یہ وحشت کس لیے؟ کوئی آواز اس کے خلاف بلند نہ ہوئی حالانکہ یزیدی فوج میں صحابی بھی موجود تھے اور صحابی زادے بھی۔ قرآن کے قاری بھی موجود تھے اور حافظ بھی۔ ابھی اسی عصر کی نماز میں یزیدیوں نے جو اذان دی تھی۔ اس میں محمدؐ کی رسالت کی گواہی بھی دی گئی تھی اور مقتول اسی ذات مقدسہ کا نواسہ تھا جس سے اس ذات کو بہت محبت تھی۔

فاتح فوج لوٹ مار کرتی ہے لیکن کربلا میں اس روایت کی نہ صرف پوری پوری پیروی کی گئی بلکہ اس میں نہایت گراں قدر اضافے بھی کیے گئے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ان خیموں میں اس لمحے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت و حرمت کا ایک ایک فرد موجود ہے، یعنی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسوں کا جن سے ان کی نسل چلی تھی۔ پورا حرم ان خیموں میں پردہ نشین ہے۔ ان 'غیرت مند' مسلمانوں نے ان مخدرات عصمت کے سروں سے نہ صرف چادریں چھینیں، بلکہ خیموں کو آگ بھی لگا دی۔ یہ بھی ان غیرت مند مسلمانوں کی ایجاد ہے۔ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا تھا کہ سلطان سلطان کی عزت پر ہاتھ نہ ڈالے اور یہاں تو 'مسلمان' مسلمان پردہ نشینوں کے ہاتھ میں رسیاں ڈال رہے تھے اور کنیزیں بنا کر (میرے منہ میں خاک) عبید اللہ ابن زیاد لعین کے دربار میں پیش کرنے کو لے جا رہے تھے۔ (کون مسلمان ہے، جس کی گردن آج بھی اپنے بزرگوں کے اس فعل قبیح پر غیر مسلموں کے سامنے جھکی ہوئی نظر نہیں آ رہی۔)

حمید بن مسلم کی روایت ہے کہ میں ایک بچی کو دیکھا جس کے دامن میں آگ لگ گئی تھی اور کانوں سے خون بہہ رہا تھا، میں نے چاہا کہ اس کے دامن کی آگ بجھا دوں۔ وہ بچی یہ سمجھی کہ میں اس کو کوئی نقصان پہنچانے کے لیے اس کے پیچھے دوڑا ہوں۔ میں نے دامن کی آگ بجھائی اور خوف کی وجہ دریافت

کی تو معلوم ہوا کہ کسی لعین نے اس کے کانوں سے 'دُر' جھپٹ لیے تھے اور اس بچی کے کان زخمی ہوگئے تھے۔ توبہ۔ توبہ۔ توبہ۔ یہ مسلمان درندگی کی اس حد تک کیوں پہنچے؟ اس کا سبب سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ مسلمان ستم ایجادی میں کافروں سے سبقت لے جانا چاہتے تھے اور نئی نئی روایتیں قائم کرنا چاہتے تھے۔

عترت رسول کو قیدی بنانا بھی اس ظلم کی ابتدا تھی جو بعد میں ''اسلام'' کی جبین پر کلنک کا ٹیکا بنا رہا۔ عورتوں اور بچوں کے رسیوں سے ہاتھ باندھنے میں سوائے اذیت رسانی کے اور کون سا جذبہ کارفرما تھا۔ کیا یہ عورتیں اور بچے بھاگ جاتے۔ صرف ایک بالغ مرد اس سارے قافلے میں موجود تھا اور وہ بھی بیمار تھا۔ اس کے فرار ہونے کا بھی کوئی امکان نہیں تھا۔ ''ظلم'' کی ایک درخشاں روایت تھی جو مسلمانوں نے قائم کی۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ حنین کی قیدی عورتوں اور بچوں کو اپنی رضاعی بہن بشما کی تکریم و تعظیم کے لیے رہا کروا دیا تھا۔ بشیما مائی حلیمی دائی کی بیٹی تھیں۔ جب انھوں نے اپنا تعارف کرایا تو رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بیٹھنے کے لیے اپنی چادر بچھا دی تھی۔ عدیؓ بن حاتم کی بہن قید ہو کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش ہوئیں تو آپ ان کی تکریم و تعظیم صرف اس لیے کی کہ وہ ایک سخی مرد کی بیٹی تھیں۔

اور معرکہ کربلا کے بعد قید ہونے والی خواتین تو رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نواسیاں تھیں۔ بہوئیں تھیں، نواسوں کی بیٹیاں تھیں، علیؑ کی بیٹیاں اور بہوئیں تھیں۔ ان کے ساتھ اس رسوا کن سلوک کا مجھے تو کوئی جواز نظر نہیں آتا۔ شاید ڈاکٹر اسرار احمد اس جواز کو تلاش کر لے۔

عرب کی کسی جنگ میں کوئی ایسی مثال نہیں ملتی کہ قیدی عورتوں کے سروں

سے چادریں بھی اتروالی جائیں۔
شاید کربلا میں قائم ہونے والی اس روایت کا یہ اثر ہے کہ مدتوں تلک بغداد و دمشق، غرناطہ و قاہرہ میں سرعام عورتوں کو نیلام کیا جاتا رہا اور جو اسلام انسانیت کے ماتھے سے غلامی کا داغ مٹانے آیا تھا، اسی کے ماتھے پر ''غلام سازی'' کا ٹیکا مدتوں تلک لگا رہا۔
اسی روایت کا نتیجہ ہے کہ آج عراق، پاکستان، ترکی، لبنان اور مصر میں عورت کے سر سے چادر اتر گئی ہے۔ بھلا ہوا ایران کی انقلابی حکومت کا کہ اس نے کربلا والوں کے صدقے میں یہ چادر پھر مسلمان عورت کے سر پر ڈال دی ہے۔

9. میں نے مسلمانوں کی تاریخ میں کہیں یہ نہیں دیکھا کہ دشمن کا سر کاٹ کر نیزے پر بلند کیا گیا ہو۔ یہ روایت بھی کربلا کے میدان میں قائم ہوئی۔ احد کی جنگ میں ستر مسلمان شہید ہوئے تھے، ان میں سے صرف دو شہیدوں کا مثلہ کیا گیا۔ (حضرت حمزہؓ اور حضرت عبداللہؓ بن جحش) لیکن کفار نے کسی شہید کا سر کاٹ کر نیزے پر بلند نہ کیا اور سروں کا یہ قافلہ مدینے سے مکے نہ پہنچا۔ کربلا کے بعد مسلمانوں نے جب فتح کے پھریرے اڑائے تو بہتر شہیدوں کے سر نیزوں پر چڑھائے اور قیدیوں کے آگے آگے یہ سر چلتے رہے اور سر قرآن کی تلاوت کرتے رہے اور مسلمان فتح کے نشے میں چور اس معجزے کو بھی درخور اعتنا نہ سمجھتے رہے۔ اللہ نے ان کی آنکھوں اور کانوں پر بدبختی و خباثت، شقاوت اور ظلم کی مہر اس مضبوطی سے لگائی کہ آج تک اس کے گلے سے لعنت کا طوق نہیں اترا اگرچہ ڈاکٹر اسرار نے اپنی سی پوری کوشش کی۔

اب میں آخر میں یہ لکھنا چاہتا ہوں کہ:

(ا) کربلا کی جنگ عالم انسانیت کا سب سے بڑا معجزہ ہے۔

(ب) اگر یہ معجزہ نہ ہوتا تو سن 10 ہجری بارہ ربیع الاول کے بعد اسلام اور مسلمان کی جس تاریخ کا آغاز ہوا اس میں مار دھاڑ اور لوٹ مار کے علاوہ اور کچھ نظر نہ آتا۔

(ج) فرض کیجیے (نعوذ باللہ) امام حسینؑ نے اگر یہ جنگ صرف اقتدار حاصل کرنے کے لیے کی (جیسا کہ ابن تمیمہ، ڈاکٹر اسرار اور مرزا منور وغیرہ کہتے ہیں)، تو بھی یہ ایک عظیم جنگ تھی کیونکہ ایک سر تو ایسا تھا جو باطل کے سامنے نہ جھکا ورنہ عبداللہ ابن عمر، عبدالرحمٰن بن ابوبکر، محمد حنیفہ بن علی، عبداللہ ابن زبیر، عبداللہ ابن عباس جیسے صحابی زادے اور خود صحابی ہونے کے دعویدار حضرات نے باطل کی بیعت کرنے ہی میں عافیت سمجھی۔ میں تو عبداللہ ابن جعفر کو بھی اسی مصلحت کوش طبقے کا ایک فرد سمجھتا ہوں حالانکہ وہ شریکۃ الحسینؑ حضرت زینب سلام اللہ علیہا کے شوہر تھے اور مولا علیؑ کے داماد۔

قنبر عباس نقوی کا نرسری میں پہلا دن

17 اکتوبر 1987ء

آج قنبر عباس نقوی اپنی ماں تطہیر صادقہ کے ساتھ اعوان کالونی کے ایک نرسری اسکول میں پہلا دن گزارنے کے لیے گیا ہے۔

آج میں گھر میں تنہا ہوں۔ میں اپنے بڑے بیٹے ظہیر الحسن نقوی کے ساتھ رہتا ہوں۔ میری بیوی ستلج بلاک میں مکان نمبر 160 میں مقیم ہیں۔ وہاں میرے دو بیٹے صغیر الحسن نقوی اور مشیر عباس نقوی قیام پذیر ہیں۔ صغیر الحسن کی بیوی نسرین فاطمہ پی۔ ٹی۔ سی ہے اور گلشن راوی کے ایک پرائمری سکول کی دوسری شفٹ میں پڑھاتی ہے۔ صغیر کے دو بیٹے ہیں سلمان صغیر اور میثم رضا۔ سلمان ستلج بلاک ایک نرسری میں جاتا ہے۔ اس کی ماں اسے 12 بجے نرسری سے واپس لے آتی ہے اور ماں کے جانے کے بعد دونوں بچے دادی کی تحویل میں آجاتے ہیں۔ صغیر اوپر کی منزل میں رہتا ہے۔ نچلی منزل میں مشیر عباس ہے۔ اُس کی بیوی طیبہ گھر ہی میں رہتی ہے۔ اس کی ایک ماہ کی بچی نجلہ بتول ہے۔ دادی اماں اس مکان میں اکیلی نہیں۔ انہیں سلمان، میثم، نجلہ کی رفاقت حاصل ہے۔

آج قنبر کے نرسری میں داخل ہونے کی وجہ سے میں اپنے آپ کو اکیلا محسوس کرتا ہوں۔ یہ بھی سوچتا ہوں کہ آج قنبر کے کیا جذبات ہوں گے۔ وہ عام بچوں سے خاصا مختلف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے چہاردہ معصومینؑ کی طفیل کافی زیادہ ذہانت عطا فرمائی ہوئی ہے۔ وہ ساڑھے تین سال کی عمر میں ابتدائی قاعدے پڑھ چکا ہے۔ باہر اسے کسی نے پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا لیکن اردو اور انگریزی کے حروف تہجی اور دس تک گنتی اسے خوب یاد ہے۔ عجیب بات ہے کہ وہ ا، ب، ج یا اے بی سی کہتے یا ان کی مہارنی کرنے سے بہت گریزاں رہتا ہے جیسے یہ علم اس کی ذہانت سے پست درجہ رکھتا

ہو۔

اس کی عمر ابھی ساڑھے تین سال سے بھی سترہ دن کم ہے۔

پتہ نہیں کیا وجہ ہے کہ جب کوئی بچہ پہلی بار اسکول جاتا ہے، تو میرے دل میں عجیب ''اوجھلے'' سے پھرتے ہیں۔ 'اوجھلے' پنجابی لفظ ہے جس کے معنی بھی میں بیان کرنے پر قادر نہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے اس کا بے فکری کا زمانہ ختم ہوگیا ہو اور فکر و تردد کا ایک بارِ عظیم اس پر لادا جا رہا ہو۔

ہمارے زمانے میں، نہیں میرے بچوں کے زمانے میں بھی اسکول کا آغاز پانچ یا چھ سال کی عمر سے ہوتا تھا۔ کھیلنے کودنے کے کم از کم پانچ سال تو ہمیں مل جاتے تھے۔ اب نرسریوں نے انہیں بھی گھٹا دیا ہے۔ یہ نرسریاں کیا ہیں، قید خانے ہیں جہاں چند عورتیں محافظ ہیں اور بچوں کو چار پانچ گھنٹے تک اپنے پاس محفوظ رکھتی ہیں۔ یہ کنڈرگارٹن نرسریاں نہیں کہ جہاں بچوں کی دلچسپی کا وافر سامان موجود ہو۔ گھر کے ایک چھوٹے سے صحن میں جہاں ایک بچہ کھیلتا پھرتا ہے، وہاں اب بیسیوں بچے کھیل کود کے لیے بھر دیے گئے ہیں اور صحن کی زمین انچوں میں بٹ گئی ہے۔

لیکن یہ زمانہ حال کی مجبوری ہے۔ میری بھتیجی اور بہو یعنی قنبر کی ماں وہاں سے قریب ایک ماڈل اسکول میں پڑھاتی ہے۔

ہمارے زمانے کی نرسری میاں جی کا گھر تھا یا مسجد کا صحن۔ ہمارے گاؤں بھڑتھ میں لڑکیاں بی بی جی سے قاعدہ قرآن پڑھتی تھیں اور لڑکے صحن مسجد میں میاں جی سے قاعدہ قرآن پڑھتے۔ کبھی ''بسم اللہ'' کی تقریب بڑے احترام اور شان سے منائی جاتی تھی۔ حاضرین میں مٹھائی بانٹی جاتی تھی۔ بچے کو نئے کپڑے پہنائے جاتے تھے۔ اس سے تعلیم و تعلّم کی شان قائم ہوتی تھی۔ آج کل فیس پر زیادہ زور رہے۔ بس فیس دے دو اور بچے کو اسکول بٹھا آؤ۔ اللہ اللہ خیر صلا۔

گذشتہ تین سال سے قنبر عباس میرا رفیق تنہائی تھا۔

ہوا یوں کہ دسمبر 1984ء میں تطہیر کی ''مانگا منڈی'' میں تقرری بحیثیت انگلش ٹیچر ہوئی۔ غالباً اس نے 1971ء میں بی۔ایڈ کیا تھا اور بی۔ایڈ کرنے سے پہلے وہ میری بہو بن کر آ گئی تھی۔ ان دنوں ظہیر کی والدہ کچھ زیادہ ہی بیمار تھیں۔ اس لیے بہو کو پورا گھر سنبھالنا پڑا۔ یوں بھی لاہور کے اندر ملازمت نہیں ملتی تھی۔ ''مانگا منڈی'' آنا جانا کچھ مشکل نہ تھا۔ ظہیر نے کہا کہ اقتصادی طور پر میں اکیلا اپنا گھر کا خرچ پورا نہیں کر سکتا۔ میں نے کہا کہ خدا مالک ہے، میں ریٹائر نہ ہوتا تو شاید تم ایسا نہ کہتے۔ بہر حال پنشن میں سے کچھ نہ کچھ مدد تو میں تمہاری کرتا رہوں گا۔ وہ مصر ہوا تو تطہیر سے پوچھا۔ اس نے بھی یہی کہا کہ حالات کے مطابق نوکری کر لینا بہتر ہے۔ ان دنوں میری بیوی پر تبخیر اور تیزابیت کا بہت غلبہ تھا اور وہ صاحب فراش تھیں۔ میری والدہ بھی میرے پاس تھیں۔ ان کی عمر اسی سال کی ہو چکی تھی۔ انہیں بھی خدمت کی ضرورت تھی۔ قنبر کی عمر چھ سات ماہ تھی۔ مجھے میری بیوی نے مشورہ دیا کہ آپ انہیں نہ روکیں۔ میں نے ہتھیار ڈال دیے۔

میں بھی کچھ زیادہ صحت مند نہیں تھا لیکن میں نے والدہ کی خدمت بھی کی اور اپنی بیوی کی دیکھ بھال میں حسب مقدور کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ قنبر جب جاگتا تو میں فیڈر لے کر اس کے پاس پہنچ جاتا۔ وہ ماں کا دودھ پیتا تھا۔ اس لیے فیڈر سے ذرا دیر بعد مانوس ہوا۔ اس کے بعد اسے فیڈر سے ایسی محبت ہوئی کہ اب بھی وہ دن میں دو مرتبہ فیڈر پیتا ہے۔ قنبر جب جاگتا تو اس کی پہلی نظر میرے چہرے پر پڑتی۔ ایک ہفتے بعد اس نظر کے ساتھ مسکراہٹ بھی شامل ہوگئی۔ یہ مسکراہٹ گویا میری خدمات کا اعتراف تھی۔ اب بھی اس کی شبنم دل میں موجود ہے۔ اب وہ بڑا ہو گیا ہے۔ اب تو وہ مجھے مارتا پیٹتا بھی ہے۔ ذرا ناراض ہو جائے تو روٹھ جاتا ہے۔ ہر روز اسے ''دو روپے'' کی کار لے کر نہ دوں، تو میری جان کو آ جاتا ہے۔ مجھے گالی بھی دے لیتا ہے۔ کل ہی کی بات ہے، دو روپے کی کار لے کر اس کے پہیے نکال دیے۔ میں نے اس کے ہاتھ سے جھپٹ

ہوا یوں کہ دسمبر 1984ء میں تطہیر کی ''مانگا منڈی'' میں تقرری بحیثیت انگلش ٹیچر ہوئی۔ غالباً اس نے 1971ء میں بی۔ ایڈ کیا تھا اور بی۔ ایڈ کرنے سے پہلے وہ میری بہو بن کر آ گئی تھی۔ ان دنوں ظہیر کی والدہ کچھ زیادہ ہی بیمار تھیں۔ اس لیے بہو کو پورا گھر سنبھالنا پڑا۔ یوں بھی لاہور کے اندر ملازمت نہیں ملتی تھی۔ ''مانگا منڈی'' آنا جانا کچھ مشکل نہ تھا۔ ظہیر نے کہا کہ اقتصادی طور پر میں اکیلا اپنا گھر کا خرچ پورا نہیں کر سکتا۔ میں نے کہا کہ خدا مالک ہے، میں ریٹائر نہ ہوتا تو شاید تم ایسا نہ کہتے۔ بہرحال پنشن میں سے کچھ نہ کچھ مدد تو میں تمہاری کرتا رہوں گا۔ وہ مصر ہوا تو تطہیر سے پوچھا۔ اس نے بھی یہی کہا کہ حالات کے مطابق نوکری کر لینا بہتر ہے۔ ان دنوں میری بیوی پر تبخیر اور تیزابیت کا بہت غلبہ تھا اور وہ صاحب فراش تھیں۔ میری والدہ بھی میرے پاس تھیں۔ ان کی عمر اسی سال کی ہو چکی تھی۔ انہیں بھی خدمت کی ضرورت تھی۔ قنبر کی عمر چھ سات ماہ تھی۔ مجھے میری بیوی نے مشورہ دیا کہ آپ انہیں نہ روکیں۔ میں نے ہتھیار ڈال دیے۔

میں بھی کچھ زیادہ صحت مند نہیں تھا لیکن میں نے والدہ کی خدمت بھی کی اور اپنی بیوی کی دیکھ بھال میں حسب مقدور کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ قنبر جب جاگتا تو میں فیڈر لے کر اس کے پاس پہنچ جاتا۔ وہ ماں کا دودھ پیتا تھا۔ اس لیے فیڈر سے ذرا دیر بعد مانوس ہوا۔ اس کے بعد اسے فیڈر سے ایسی محبت ہوئی کہ اب بھی وہ دن میں دو مرتبہ فیڈر پیتا ہے۔ قنبر جب جاگتا تو اس کی پہلی نظر میرے چہرے پر پڑتی۔ ایک ہفتے بعد اس نظر کے ساتھ مسکراہٹ بھی شامل ہوگئی۔ یہ مسکراہٹ گویا میری خدمات کا اعتراف تھی۔ اب بھی اس کی شبنم دل میں موجود ہے۔ اب وہ بڑا ہو گیا ہے۔ اب تو وہ مجھے مارتا پیٹتا بھی ہے۔ ذرا ناراض ہو جائے تو روٹھ جاتا ہے۔ ہر روز اسے ''دو روپے'' کی کار لے کر نہ دوں، تو میری جان کو آ جاتا ہے۔ مجھے گالی بھی دے لیتا ہے۔ کل ہی کی بات ہے، دو روپے کی کار لے کر اس کے پہیے نکال دیے۔ میں نے اس کے ہاتھ سے جھپٹ

لی تو اس کے منہ پر لگ گئی۔ رونے لگا تو میں خاموش رہا۔ چار منٹوں کے بعد کہنے لگا
''غلام الثقلین! تم نے مجھے کیوں مارا؟''

سب کے نام جانتا ہے۔ آج سے نہیں ڈیڑھ دو سال کی عمر سے لیکن میرے نام کا استعمال اور اس طرز کے فقرے میں، میرے لیے اجنبی تھا۔ میں بھونچکارہ گیا۔ پھر میں نے اسے سینے سے لگا لیا اور پلاسٹک کی کار کے پہیے جوڑ دیے۔

مجھے بچوں کی پیٹھ دھونے سے بہت گھن آتی تھی۔

میں قنبر عباس کی پیٹھ اب تک دھوتا ہوں اور اب مجھے گھن نہیں آتی۔

کبھی کبھار مجھے افسوس ہوتا ہے کہ اتنی محبت اپنے دوسرے پوتوں اور پوتیوں کو نہیں دے سکا۔ عقیلہ اور فضیلہ مکے میں ہیں اور حرم خدا کے سایہ عاطفت میں انہیں میری محبت کی کیا ضرورت ہے۔ صائمہ، عظمیٰ اور زہیر یہیں میرے پاس رہتے ہیں۔ انہیں میری محبت سے بہرہ ور ہونے کا موقع ملتا رہتا ہے۔ البتہ سلمان اور میثم کو میں ''محبت'' کا ان کا حصہ نہیں دے سکا۔ میثم مجھے کافی ذہین نظر آتا ہے۔

نجلہ ابھی ایک ماہ کی ہے۔

اولاد انسان کے لیے فتنہ (آزمائش) قرار دی گئی ہے۔

میں نے اپنے بیٹوں اور بیٹی کو اپنے لیے کسی فتنہ نہیں بنایا (الحمد اللہ)

لیکن میرے پوتے، پوتیاں اور دوہتے میرے لیے فتنہ ضرور بن گئے ہیں (شکر الحمد اِللہ!)

میرا دل ان میں ''ٹنگا'' ہوا ہے۔

کسی کو چھینک بھی آجائے تو میری جان پر بن جاتی ہے۔

نماز پڑھتا ہوں تو شائد خدا کے لیے، نہیں، ان کے لیے پڑھتا ہوں۔

ہر دُعا میں میں کبھی مکے پہنچتا ہوں، کبھی ستلج بلاک میں اور کبھی ڈھوک کھبہ (راولپنڈی) کے اس تنگ مکان میں جہاں میرے دوہتے رہتے ہیں۔

میں ان کی صحت، درازی عمر، خوش نصیبی اور سعادت (دینی و دنیوی) کے لیے دعائیں مانگتے نہیں تھکتا۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ میں اپنی عبادت میں وہ detached رویہ نہیں پیدا کرسکا جس کا تقاضا معبود حقیقی کرتا ہے۔

لیکن ان بچوں کی محبت کا صدقہ ہے کہ میں دنیا کے ہر بچے سے محبت کرتا ہوں۔ بچے گلیوں میں کھیل رہے ہوں تو اس منظر سے میرا دل باغ باغ ہوجاتا ہے۔ کسی گھر سے بچے کی کلکاری مارنے کی آواز آئے، تو میرے اندر کا بچہ قہقہہ لگا کر ہنستا ہے۔ کسی بچے کو بھیک مانگتے دیکھتا ہوں یا کوئی محنت مزدوری کا سخت کام تو میری ساری خوشیاں شرم کے مارے پانی پانی ہوجاتی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ افلاس وغربت کے اس گناہ کا ذمہ دار میں ہوں۔

اب بارہ بج گئے ہیں۔

انشاء اللہ قنبر عباس اپنی ماں کے ساتھ ایک بجے تک گھر لوٹ آئے گا۔

صائمہ، عظمیٰ اور زہیر بھی اسکول سے واپس آجائیں گے۔

گھر بھر جائے گا اور میرا سینہ بھی!

درود ہو محمد ﷺ و آل محمد ﷺ پر۔

یا اللہ! سب کا بھلا اور سب کے ساتھ میرا بھی بھلا!

ہاں یاد آیا! قنبر عباس کا ابو ظہیر الحسن نقوی ان دنوں ویلز یو کے میں ہے۔

وہاں تین سال تک رہے گا اور انشاء اللہ پی۔ ایچ۔ ڈی کر کے گھر واپس آئے گا۔

اس کی عمر اس وقت تینتالیس سال ہے اور اللہ نے اس پر یہ کرم کیا ہے، دیر سے سہی لیکن بروقت اس لیے کہ بچوں کی نگہداشت کا اسے زیادہ فکر نہیں۔

اے اللہ! اپنے رسول محمد ﷺ اور اس کی آلؑ کی طفیل ان سب کو اپنے حفظ و

امان کے قلعے میں معون و مامون رکھ! آمین!

نرسری میں قنبر عباس کا پہلا دن نہایت خوبی سے گزرا۔

ایک بجے واپس آیا تو ڈرائنگ روم میں میرے پاس شیخ نصیر احمد عاصی بیٹھے تھے۔ وہ قنبر کے بہت شیدائی ہیں۔ آتے ہی قنبر کو آواز دی (قنبر صاحب!) میں نے بتایا کہ آج سے وہ نرسری میں چلا گیا ہے۔ قنبر واپس آیا تو میں نے اسے ڈرائنگ روم میں بلایا۔ اس نے عاصی صاحب سے ہاتھ ملایا اور کہا ''وہاں بھی دادا جی تھے۔'' کہاں؟ میں نے کہا۔ ''جناح پبلک سکول میں۔'' اس نے جواب دیا۔ عاصی صاحب کے جانے بعد راز کھلا کہ جناح پبلک سکول کے مالک اور پرنسپل ایک بزرگ ہیں جن کی سفید داڑھی ہے اور قنبر نے نرسری کا پہلا دن ان کے ساتھ کرسی پر بیٹھ کر اور باتیں کرتے گزار دیا۔

اب دیکھیے اس صورت حال سے کیا نتیجہ نکلتا ہے؟ تطہیر نے بتایا کہ پرنسپل صاحب کہہ رہے تھے، قنبر نے مجھے بھی دادا کہا وہ غالباً اولا دِ نرینہ سے محروم ہیں اور ان کی لڑکیاں اسکول میں پڑھاتی ہیں۔ قنبر کی اس ادا پر وہ بہت خوش تھے۔ میں بھی خوش ہوں کہ میری جگہ خالی نہیں ہوئی لیکن ایک خدشہ بھی ہے کہ کہیں قنبر سکول کے ماحول سے مانوس ہونے میں دیر نہ لگے۔ اسکول نے دو رنگین قاعدے (حروف تہجی) اسے قیمتاً دیے ہیں۔ انگریزی کے قاعدے میں ایک شیر کی تصویر بنی ہے۔ قنبر نے مجھ سے پوچھا ''یہ ببر شیر ہے۔'' میں نے جواب دیا ہاں اس نے پھر پوچھا ''یہ رو کیوں رہا ہے؟'' میں حیران رہ گیا۔ ذرا غور کیا تو آرٹسٹ نے واقعی اس بیچارے شیر کا چہرہ ایسا بنایا ہے کہ بسورتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ میں کھلکھلا کر ہنسا۔ آج رات قنبر نے دونوں قاعدے (یعنی حروف تہجی) ختم کر لیے ہیں۔

ڈاکٹر حامد عقیل نے مجھ سے پوچھا ''باوا جی Lower Nursry کے چھ مہینے تو آج ہی ختم ہو گئے۔ اب بیچاری استانی اسے کیا پڑھائے گی؟''

مردہ بستی اور بے یقینی کا عذاب

10 اکتوبر 1987ء

''17 فروری 1981ء سے افسانہ مجھے چھوڑ گیا ہے۔'' (افسانے کا عنوان ''اک بوند لہو کی۔'')

یہ میرے افسانوں کے آخری مجموعے ''دھوپ کا سایہ'' کے دیباچے کا دوسرا جملہ ہے۔

14 نومبر 1987ء کی صبح کو ایسا اتفاق ہوا کہ میں نے 'ایک افسانچہ' مکمل کر لیا۔

یہ نامکمل افسانہ ایک مدت سے میری ایک نوٹ بک میں ادھورا پڑا ہوا تھا۔ اس کا انجام نہیں سوجھ رہا تھا۔ اس صبح کو سوجھ گیا اور افسانہ تکمیل تک پہنچ گیا۔

میں بہت خوش ہوا کہ روانی طبع پر جو بند لگ گیا تھا، وہ ٹوٹ گیا ہے۔

میں حیران بھی ہوا کہ ''افسانے'' کے ساتھ ٹوٹا ہوا رابطہ اتنی آسانی سے کیسے بحال ہو گیا۔ حیرت اب تک قائم ہے اور خوشی باقی نہیں رہی۔

کیونکہ جس افسانہ نگار نے یہ افسانہ مکمل کیا تھا، وہ پھر اپنے خول میں سمٹ گیا ہے۔

اس کا پس منظر یوں ہے۔

12 اکتوبر کو ایف۔سی کالج کے صدر شعبہ اردو ڈاکٹر آغا سہیل صاحب نے فون کیا کہ ٹیلی ویژن لاہور کے پروڈیوسر محمد عظیم صاحب ایک ادبی پروگرام میں آپ سے ایک افسانہ پڑھوانا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا کہ میرے پاس تو کوئی افسانہ موجود نہیں۔ انھوں نے کہا کہ لکھ لیجیے۔ کسی پرانے افسانے میں قطع و برید کر لیجیے۔ ایک دو افسانے دیکھے لیکن ''خلاصہ'' لکھنے کو جی نہ چاہا۔ 13 اکتوبر کو محمد عظیم صاحب کے

اسسٹنٹ پروڈیوسر تشریف لائے۔ وہ کہنے لگے کہ کوئی ایسا افسانہ لکھیے جو علامتی ہو اور اس پر اچھی بحث ہو سکے۔ اچانک ذہن اس ادھورے افسانے کی طرف منتقل ہوا۔ پرانی نوٹ بک کی تلاش میں کئی گھنٹے صرف ہوگئے۔ سوچا کے صبح کوشش کروں گا۔ 14 کی صبح کو نو بجے یہ افسانہ اچانک مکمل ہوگیا۔ اسی دن ریکارڈ ہوگیا۔ اس دن بند نزلے زکام کی وجہ سے اعضا شکنی ہو رہی تھی اور بخار کی کیفیت تھی۔ سانس کی تکلیف بھی ہے۔ وینٹولین ان ہیلر کے دو مرتبہ کش لینے پڑے۔ ریکارڈنگ کے دوران اختلاج قلب رہا اور ہاتھ بھی کانپتے رہے۔ ابھی یہ پروگرام 'ٹیلی کاسٹ' نہیں ہوا ورنہ اپنی حالت پر ہنسنے کا موقع مل جاتا۔ اس پروگرام کا نام ''بزم'' ہے۔

چھٹی کل اہل قلم کانفرس (17، 18 اکتوبر 1987ء)

4 نومبر 1986ء

چھٹی کل اہل قلم کانفرنس کا دعوت نامہ ملا تو بہت خوشی ہوئی۔

ایک مدت سے لاہور سے باہر نہیں نکل سکا تھا۔ میری بیٹی پنڈی میں رہتی ہے۔ دو سال پہلے پچھلی اہل قلم کانفرنس میں اس کے ہاں دو تین روز رہا تھا۔ اگرچہ وہ لاہور میں آ کر دو تین بار مل گئی تھی لیکن اسے گلہ تھا کہ میں اس سے ملنے نہیں آتا۔

اس سال گرمیوں میں پختہ ارادہ تھا کہ پنڈی جاؤں گا اور مری یا ایبٹ آباد میں جا کر پہاڑوں کا نظارہ کرلوں گا۔ پہاڑوں سے مجھے بہت محبت ہے اور انہیں دیکھ کر روح کو بالیدگی ملتی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے روح اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز ہو۔ میدانوں میں رہ کر زمین سے قدم چپک جاتے ہیں اور اب جوں جوں موت قریب تر آتی چلی جا رہی ہے، یوں لگتا ہے جیسے قبر کی تنگنائی کے تصور سے دم گھٹ رہا ہو (ممکن ہے کہ اس تصور میں دمے کی وجہ سے جو کیفیت محسوس ہوتی ہے، اس کو بھی کچھ دخل ہو۔) لیکن یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔ جماعت نہم و دہم اردو کی درسی کتاب کی ترمیم و اصلاح

میں گرمیوں کا تقریباً ڈیڑھ مہینہ صرف ہوگیا اور ''جہد روزگار'' نے رومانوی خواہش کا گلا گھونٹ دیا۔ یوں تک اب بھی دل میں ہزاروں خواہشیں موجود ہیں، لیکن دوخواہشوں پر واقعی دم نکلتا ہے۔ ایک خواہش تو کربلا، نجف، بغداد، سامرہ اور مشہد مقدس کی زیارات کی ہے اور دوسری پاکستان کے کوہستانی علاقے کی سیر۔ صدر صدام کوشکست ہو تو عراق کا راستہ کھلے۔ ایران حق پر ہے لیکن حق کو باطل پر غالب آنے میں بہت دیر لگتی ہے اور اب تو باطل کی امداد کے لیے شیطان بزرگ امریکہ بھی خلیج فارس میں اتر آیا ہے۔ خدا اسے برباد کرے!)۔ یوں لگتا ہے کہ کربلا و نجف ابھی بہت دور ہیں۔ اب رہی پاکستان کے کوہستانی علاقے کی سیر، تو اس کے لیے ایک ساتھی اور جسمانی ہمت کی ضرورت ہے ساتھی بھی کوئی نہیں ملتا اور جسمانی ہمت کی سطح اتنی پست ہے کہ ایک میل پیدل چل کر جسم توانائی سے یکسر محروم ہوجاتا ہے۔ مزہ تو اسی میں ہے کہ بس پر سفر کیا جائے اور راستے کے کوہستانی نظاروں سے محظوظ ہوا جائے۔ یہ ناممکن ہے اور اتنی مالی فراغت نہیں کہ ہوائی جہاز پر سفر کیا جائے اور شانگری لا میں قیام کیا جائے۔

یہ ضمنی جملہ بہت طویل ہوگیا۔

اسلام آباد میں تین راتیں رہنے کا موقع ملا۔ قیام ہالی ڈے ان کے کمرہ نمبر 112 میں تھا۔ صبح نماز پڑھ کر شیشے سے پردہ سرکاتا تو ''مارگلا'' کے پہاڑ لپک کر آتے اور کھڑکی سے مل جاتے۔ ایک عجیب سا کیف دل و دماغ کو اپنی بھرپور آغوش محبت میں لے لیتا۔ وہ جو کسی نے کہا ہے کہ ہم جیسے کامل ایمان لوگوں کے لیے رسول ﷺ نہ بھی آتے تو صبح بھی کافی ہے صرف اس تعریف کے بعد درست معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے رسولوں میں ایک رسول اُس کا ''صبح'' بھی ہے۔ اسلام آباد کی یہ دھلی دھلائی، صاف و شفاف صبح 'ایمان' میں اضافے کا باعث ہوتی۔

اس کمرے میں رحمٰن مذنب میری ساتھی تھے۔ صبح سیر کے لیے باہر نکلتے تو سڑکوں کے اردگرد جنگلوں کا منظر اس کیف میں اور بھی اضافہ کرتا۔ رحمٰن مذنب صاحب

سیر کے بہت شیدائی ہیں۔

ایک دن پہاڑوں پر کالے کالے بادلوں کا منظر بھی دیکھا جو ان کی چوٹیوں کو چھو رہے تھے۔ جی تو چاہتا تھا کہ پہاڑ پر کھڑے ہو کر نیچے وادیوں میں اُڑتے ہوئے بادلوں کا منظر دیکھا جائے لیکن اس کے لیے مری نہ جا سکا۔ وہاں موسم کی پہلی برف پڑی تھی اور میرے پاس گرم کپڑا نہیں تھا۔ یوں بھی صحت خاصی کمزور ہے۔

اس بار چھٹی اہلِ قلم کانفرنس میں آٹھ سو پچاس ادیب شامل ہوئے۔ دیہات اور قصبات کے ادیبوں کو بھی شامل ہونے کا موقع فراہم کیا گیا۔ صوبائی اور لسانی وحدت پیدا کرنے کے لیے اتنا بڑا اجتماع اپنا جواز آپ تھا۔ بہت سے ادیبوں سے ملاقات ہوئی۔ ڈاکٹر وزیر آغا اور احمد ندیم قاسمی دونوں زعما شامل نہیں ہوئے تھے۔

ڈاکٹر انور سدید صاحب فلیش مین ہوٹل میں ٹھہرے تھے۔ کانفرنس کے اجلاس میں ان سے ملاقات ہوتی رہی۔ رحمٰن مذنب میرے دیرینہ دوست ہیں۔ ان کا ساتھ بہت خوشگوار ثابت ہو۔

اسلام آباد بہت خوبصورت شہر ہے۔ اللہ کرے کہ اس کی وسعت اور کشادگی میں بڑے شہروں کی گھٹن اور تعفن پیدا نہ ہو۔

پنڈی کے ڈھوک کھبا میں آ کر محسوس ہوا کہ خوشبو اور بدبو میں کتنا فرق ہوتا ہے۔ میرے داماد کا کرائے پر لیا ہوا مکان بہت تنگ ہے۔ قریب ہی گندا نالہ ہے۔ سامنے ایک پلاٹ خالی ہے جس میں سارا محلّہ اپنا کوڑا کرکٹ پھینکتا ہے۔ جس کمرے میں میں سوتا تھا، اس کے باہر کھلنے والے دروازے کے قریب گٹر ہے جس سے وقفے وقفے کے بعد بدبو کے بھبکے آتے ہیں۔ کمرے کے اندر خوشبو والی بھاپ چھڑکی گئی تھی، پھر بھی 'بدبو' نے ناک میں دم کر دیا۔

ہالی ڈے ان کی تین راتیں سوتے جاگتے ابو الحسن کا خواب معلوم ہونے لگیں۔ بیوی نے مطالبہ کیا کہ اسے فیصل مسجد دکھائی جائے۔ چنانچہ بیوی اور لڑکی کو فیصل

مسجد لے گیا۔ جدید دور کے جلال و جمال کی مظہر اس مسجد نے بہت متاثر کیا، مارگلا کی ایک پہاڑی کے دامن میں واقع ہونے کی وجہ سے اس کے ماحول میں بھی ایک خاص طرح کی رفعت کا احساس ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ وسیع لان ہیں۔ دھوپ کی بے داغ چادر نے اس مظہر کے حسن میں اور اضافہ کر دیا تھا۔ آسمان پر اس دن بادل کا ایک ٹکڑا بھی نہیں تھا۔ پہاڑ کے سرسبز دامن پر نظر جما کر آسمان کی طرف دیکھتا تو دھوپ کے باوجود وہ گہرا نیلا نظر آتا۔ نیلے رنگ سے شاید اسی وجہ سے مجھے بہت پیار ہے۔ مسجد سے واپسی پر ان خوبصورت کوٹھیوں کو حسرت سے دیکھا جو اس خوبصورت منظر کا ایک جزو بن کر اس سے کسب حسن کر رہی تھیں۔ ان کوٹھیوں کے مکین کتنے خوش قسمت ہیں کہ صبح سے شام تک کے بدلتے ہوئے حسین مناظر کا ایک جزو بن گئے ہیں۔

کاش اس جگہ پر مجھے ایک ''کٹیا'' ہی مل جاتی۔

کیا پتہ عبادت میں اس قطرہ شبنم کی تمنائے رفعت پیدا ہو جاتی جو سورج کی ایک کرن سے مدغم ہو کر سوئے فلک پرواز کر جاتا ہے۔ رشک و حسد کی اس طوفانی لہر میں بہت عرصے تک ڈوبا رہا۔ سوچا! الٰہی! اسلام آباد کے ان محلات میں رہنے والے بھی تیرے ہی بندے ہیں اور وہ بھی جو ڈھوک کھبا کے ایک تنگ و تاریک اور بدبودار مکان میں رہنے پر مجبور ہیں۔ تب اپنے سے کم تر لوگوں کی طرف نظر کی تو شرم آئی۔ سوچا کہ اس ذلیل کن اور رسوائی آمیز نظام معیشت کا پرزہ ہو کر اس پر مطمئن ہونا انسانیت کی کتنی بڑی تذلیل ہے۔ انسان کو نہ جانے اس ذلت نفس سے کب نجات ملے گی۔

اس صبح اسلام آباد جاتے ہوئے وہ قبرستان بھی دیکھا جہاں ڈھوک کھبا کے ہولناک قتل کے مظلوم بارہ مقتول دفن ہیں۔ وہ مکان بھی دیکھا جس میں ہتھوڑا گروپ کے قاتلوں نے یہ خون ریز ڈراما کھیلا۔

اس واقعے کی یاد نے رونگٹے کھڑے کر دیے۔

ظلم و شقاوت کے اس حادثے کی یاد کو بہت مشکل سے ذہن سے محو کیا۔

بزم

14 نومبر 1987ء

کل رات نو بج کر چالیس منٹ پر پروگرام ''بزم'' ٹیلی کاسٹ ہوا۔ افسانہ ٹھیک ہی پڑھ لیا۔ میرے بے تکلف دوست ساڑھے تین سالہ قنبر عباس سلّمہٗ نے پوچھا ''غلام الثقلین! تم وہاں اندر کیسے آ گئے؟'' وہ میرے ساتھ بیٹھا پروگرام دیکھ رہا تھا۔ اس کی حیرت بجا تھی کہ ایک غلام الثقلین تو اس کے پاس بیٹھا ہوا تھا اور دوسرا اسے سکرین پر نظر آ رہا تھا۔

یکا یک خیال حضرت علی علیہ السلام کے اس معجزے کی طرف منتقل ہو گیا کہ وہ ایک ہی وقت میں چالیس مقامات پر دیکھے گئے۔ صوفیا کے تذکروں میں بھی پڑھا ہے کہ بعض بزرگوں کو ''طے الارض کی کرامت حاصل تھی مثلاً ایک بزرگ کو لوگوں نے حج کرتے ہوئے دیکھا، حالانکہ حج کے روز وہ اپنے مریدوں کے حلقے میں بیٹھے تھے۔''

کبھی میں ان کرامات کو ''پیراں نمے پرند، مریدوں می پرانند'' کے مصداق کہانیاں سمجھتا تھا لیکن کل قنبر عباس نے ماشاء اللہ جس ذہانت آمیز حیرت کا اظہار کیا، اس سے یقین ہوا کہ انسان کے پاس اتنی قوت ضرور موجود ہے کہ وہ بغیر کسی مادی وسیلے اور واسطے کے اُن ہوائی لہروں کو اپنے قبضہ قدرت میں لے سکتا ہے جو تصویر اور آواز کو ایک ہی وقت میں ایک جگہ سے دنیا کے کونے کونے میں منتقل کر سکتی ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

صدر جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم

8 اگست 1988ء صبح۔ سات بجے

کل 7 اگست 1988ء بمطابق 3 محرم الحرام رات کو آٹھ بجے ٹیلی ویژن پر اعلان ہوا کہ ہوائی جہاز کے ایک حادثے میں صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق ہلاک ہوگئے ہیں۔ (انا اللہ وانا الیہ راجعون)

یہ خبر مجھے پانچ منٹ قبل میرا بیٹا مشیر عباس فون پر دے چکا تھا۔ وہ جنگ اخبار کے کمپیوٹر سیکشن میں کام کرتا ہے۔ اسے اخبار کے کسی دوست نے مطلع کیا تھا۔

نو بجے کی خبروں میں تفصیل معلوم ہوئی۔ صدر کے ساتھ اس حادثے میں کئی جرنیل اور فوجی افسر بھی ہلاک ہوگئے ہیں۔ ہلاک ہونے والوں میں ایک ادیب بریگیڈیر صدیق سالک بھی شامل ہیں۔ سب سے زیادہ پُراسرار خبر یہ ہے کہ اسی فہرست میں امریکہ کے سفیر رافیل کا نام بھی شامل ہے۔ وہ بہاولپور میں فوج کی مشقیں دیکھنے آئے تھے۔ امریکہ کے سفیر کا ان کے ساتھ ہونا ایک عجیب وغریب بات ہے جسے کوئی بھی معنی پہنائے جاسکتے ہیں۔

خدا جانے یہ حادثہ ہے یا کوئی تخریبی واقعہ!

بہرحال صدر ضیاء الحق کا دور اچانک اختتام تک پہنچ گیا۔ ابھی ابھی انہوں نے اسمبلیاں توڑ کر اپنے اقتدار کو دوام بخشنے کی کوشش کی تھی۔ ایک مضحکہ خیز ریفرینڈم کے ذریعے وہ مارچ 1992 تک پاکستان کے صدر تھے۔ اس کے بعد بھی وہ اقتدار سے دستبردار ہونے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے تھے۔ ہوائی جہاز کے کسی معمولی سے پرزے کی خرابی نے ان کے ارادے کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ کیا اس میں اس پُراسرار طاقت کا کوئی اشارہ شامل ہے جسے خدا کا نام دیا جاتا ہے یہ اس لایعنی حقیقت کا کرشمہ ہے کہ جو موت وحیات کے معمے کا ایک نہایت بے کسانہ حل ہے۔ انسان اس معاملے

میں کتنا مجبور ہے۔

صدر ضیاء الحق جب مارشل لا لگا کر اقتدار میں آئے تھے تو اکثر سیاستدان بہت خوش ہوئے تھے۔ ان میں وہ دانشور اور صحافی بھی شامل تھے جو ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کے دشمن ہے۔ مجھے ان کے اقتدار میں آنے سے بہت دکھ ہوا تھا۔ مجھے یہ خطرہ تھا کہ کہیں یہ شخص بھی دوسرا یحییٰ خاں ثابت نہ ہو۔ ذوالفقار علی بھٹو کو جب موت کی سزا دی گئی تو مجھے اس شخص سے بہت زیادہ نفرت ہوئی۔ ٹیلی ویژن پر میں اسے دیکھنے کا روادار نہ تھا۔ شروع شروع میں اس کی تقریر سے یہی تاثر ملتا کہ یہ نہایت احمق شخص ہے۔ لکھی ہوئی تقریر پڑھتے پڑھتے جب وہ عینک اتار کر کوئی بات زبانی کرنا چاہتا تو لوگ کہتے ''اب آیا کوئی لطیفہ!''۔

صدر ضیاء الحق بعدازاں نہایت زیرک اور معاملہ فہم مدبر ثابت ہوئے۔ آہستہ آہستہ انہوں نے اپنا مقام بنا لیا۔ 90 دن کا وعدہ گیارہ سالوں پر محیط ہوگیا۔ 'وعدہ خلافی' اسی قرآن کی رو سے ایک بہت بڑا گناہ تھا جس کی آیات پڑھ کر وہ اپنی تقریر کا آغاز کرتے۔ اس وعدہ خلافی کو انہوں نے اپنے اقتدار کے قیام و استقرا کے لیے استعمال کیا۔

انہوں نے یہ تاثر دیا کہ میں ایک باعمل مسلمان ہوں اور پاکستان میں اسلامی نظام رائج کرنے کے بعد ہی اقتدار سے دستبرداری کا اعلان کروں گا۔ ان سے پہلے بھی احکام اسلام کا استحصال کرتے رہے لیکن ان کے وعدے وعید صاف طور پر ڈھوکسلے معلوم ہوتے تھے۔ صدر ضیاء نے 'اسلام' کا استحصال نہایت خلوص سے کیا۔ اسے اپنے اقتدار کا زینہ بنایا۔ تھوڑا تھوڑا کر کے اسلام نافذ بھی ہوتا رہا لیکن صرف اتنا کہ اس کی نسبت سے ان کے اقتدار میں چند مہینوں یا سالوں کا اضافہ ہوتا رہے۔ یک بارگی اسلام نافذ کرنے سے ان کی ذاتی افادیت کا جنازہ نکل جاتا۔ اس رویے سے ان کے متعلق اہل پاکستان ایک عجیب مخمصے میں گرفتار رہے۔ انہیں 'مخلص' بھی سمجھتے اور 'ریاکار' بھی۔

میں نہیں جانتا کہ وہ نفاذ اسلام کے بارے میں مخلص تھے یا ریا کار لیکن میں اتنا جانتا ہوں کہ پاکستان میں نفاذ اسلام کی تحریک کو جتنا نقصان ضیاء الحق مرحوم نے پہنچایا ہے اور کسی نے نہیں پہنچایا۔ یہی کچھ بھٹو مرحوم نے اسلامی سوشلزم کے ساتھ بھی کیا تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ صدر ضیاء الحق ایک مدبر حکمران تھے لیکن وہ اپنے پیدا کردہ کسی مسئلے کو حل کر کے نہیں گئے۔ قوم کو وہ ایک بحران میں مبتلا کر کے گئے ہیں۔ انہوں نے قومی لیڈر شپ کو پیدا ہی نہیں ہونے دیا۔ اگرچہ سینیٹر اسحاق خاں عارضی صدر بن گئے ہیں لیکن وہ ایک بیوروکریٹ ہیں، سیاسی حکمرانی کا مجھے تو ان میں کوئی جوہر نظر نہیں آتا۔ آگے اللہ بہتر جانتا ہے کہیں فوج سے پھر مارشل لا لگانے کی غلطی سرزد نہ ہو جائے۔

مسئلہ افغانستان کو صدر ضیاء نے خواہ مخواہ طول دیا۔ اب اسے سلجھانا مشکل ہے۔ ان کی اسلامی نفاذ کی سیاست نے ملک میں فرقہ واریت کا زہر پیدا کر دیا ہے۔ احسان الٰہی ظہیر اور سید عارف الحسن الحسینیؒ کے قتل اسی فرقہ واریت کا نتیجہ ہیں۔

صدر ضیا بھی ملک غلام محمد، سکندر مرزا، ایوب خاں اور یحییٰ خاں کے سلسلے کے آدمی ہیں کہ ان میں سے ہر ڈکٹیٹر کے مرنے یا معزول ہونے کے بعد جو خلا پیدا ہوا، اس نے پاکستان میں علیحدگی کی کسی نہ کسی تحریک کی حوصلہ افزائی کی۔ اب خدا کو معلوم ہے کہ سندھ میں علیحدگی کی تحریک کا کیا حال ہو۔ بہرحال اس وقت ملک لیڈر شپ کے خلا میں معلق ہے۔

صدر ضیاء اپنی خامیوں کے باوجود بڑے آدمی تھے۔ کیا ہر بڑا آدمی بڑائی کی منزل پر پہنچنے کے لیے کوئی منصوبہ تیار کرتا ہے؟ اس کے متعلق وثوق سے کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ عام طور پر بڑا آدمی .... Man of Destiny ہوتا ہے۔ قدرت اسے کوئی بہت بڑا جوہر بھی عطا کرتی ہے اور موقع کی فراہم کرتی ہے جس سے وہ فائدہ اٹھاتا ہے۔ اس کی مثال نپولین ہے۔ کیا صدر ایوب اور صدر ضیاء بھی ''تقدیر ساختہ انسان''

تھے؟ صدر ایوب کے متعلق مشہور ہے (لیکن اس کا ثبوت کوئی نہیں) کہ وہ نوابزادہ لیاقت علی خاں کے قتل کے منصوبے میں شریک تھے۔ جب جنرل افتخار کو سی۔ان۔سی بنانے کے مشورے ہو رہے تھے تو وہ ہوائی جہاز کے ایک حادثے میں ہلاک ہو گئے۔ ان کے ساتھ جنرل شیر خاں بھی، اب ایوب خاں سینیئر موسٹ افسر تھے۔سی۔ان۔سی بننے کا جو منصوبہ ان کے ذہن میں تھا، وہ اس حادثے کے بعد پورا ہو گیا۔ بعدازاں ایک واضح منصوبے کے تحت انہوں نے سکندر مرزا کو معزول کیا اور خود مارشل لا ایڈمنسٹریٹر بن گئے۔

مری کے قریب ایک گاؤں بھوربن ہے جہاں ایک مجذوب سید لال حسین بخاری کا مزار ہے جہاں تک میں نے سنا ہے، لال حسین بخاری اپنی جوانی کے زمانے میں فوج میں ملازم تھے اور شاید حوالدار کے عہدے تک پہنچے تھے۔ میرے بھائی مولانا سید سجاد حسین بخاری جو فوج میں ملازم رہے ہیں، کہتے ہیں کہ لال حسین پر اس زمانے میں بھی جذب و استغراق کے دورے پڑتے تھے لیکن وہ عام حالت میں نہایت عاقل اور ہوش مند انسان تھے۔ اسی زمانے میں فوجی (افسر اور سپاہی) ان کے عقیدت مند بن گئے تھے۔ فوج کی ملازمت ترک کر کے اپنے گاؤں آ گئے جہاں وہ ترک دنیا کر کے ایک پہاڑی پر معتکف ہو گئے۔ لوگ ان سے مرادیں مانگنے آتے تو انہیں پتھر مارتے۔ جس کی تواضع پتھروں سے کرتے، اس کے متعلق مشہور ہو جاتا کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گا۔ صدر ایوب نے بھی ان کے ہاتھ سے پتھر بھی کھائے اور مار پیٹ سے بھی مستفید ہوئے اور پھر ترقی کی راہ پر گامزن ہو گئے۔

کچھ عرصہ ہوا، صدر ضیاء الحق مرحوم بھوربن گئے تھے۔ اب مجھے معلوم نہیں کہ تقریب کون سی تھی۔ وہاں انہوں نے تقریر میں کہا کہ میں جب بریگیڈیر تھا تو یہاں آیا تھا اور سید لال حسین بخاری کی زیارت کے لیے ان کے پتھر کھاتے کھاتے، ان تک پہنچ گیا تھا۔ اس سید نے میرے منہ پر اتنے چانٹے لگائے کہ میرا منہ سرخ ہو گیا۔'' (قریب

قریب یہی الفاظ تھے)۔ صدر ضیاء الحق مرحوم نے صاف صاف تو نہیں کہا لیکن بین السطور سے واضح تھا کہ مجذوب کے اس طرز سلوک میں اس عظمت کی نوید پوشیدہ تھی جو بعد ازاں انہیں ملی یعنی دنیاوی وجاہت کی انتہا (ایک ملک کی حکومت اور سربراہی)۔ اس میں بھی یہی نتیجہ نکالتا ہوں کہ ان کے ذہن میں صدارت کی کرسی تک پہنچنے کے لیے باقاعدہ منصوبہ موجود تھا۔ بھٹو مرحوم کے دور کی آخری سیاسی کشمکش میں انہوں نے بھٹو کو اپنی پُرخلوص حمایت و وفاداری کے یقین میں اس درجہ مستغرق کیا کہ وہ ان کی طرف سے بے نیاز ہوگئے۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ ان کی حکومت کا تختہ الٹ دیں گے۔ ان کی بعد کی سیاست میں اس شک کو تقویت ملتی ہے کہ وہ ہر طرح سے کرسی صدارت حاصل کرنا چاہتے تھے۔ مکروفریب کی سیاست میں ان کا اگر کوئی حریف تھا تو وہ امیر معاویہ تھا جو تزویر کا ہر دام اسلام کے رنگ میں رنگ کر بچھاتا تھا۔

امیر معاویہ نے خلافت کو بادشاہت میں بدل کر مسلمانوں کا ذہن ہی بدل دیا کہ آج تک اسلام کے نام پر کسی تحریک کو مسلمان نے دل سے قبول نہیں کیا۔ وہ دنیاوی شان وشوکت کے پرستار بن گئے ہیں اور سیاست میں فریب کو شرعی طور پر جائز سمجھتے ہیں۔

صدر ضیاء الحق نے معذور افراد کے لیے جو اقدامات کیے ہیں۔ وہ ان کے نامہ اعمال میں ثواب بن کر لکھے جائیں گے (حالانکہ اس کا متحرک بھی ان کی معذور بیٹی ہے)۔ بہرحال ذاتی طور پر بھی انہوں نے عیش وعشرت، شراب نوشی اور ناؤنوش کی روایت کو ایوان صدر سے دیس نکالا دیا۔ یہ اچھا عمل بھی ان کے نامہ اعمال میں انشاء اللہ لکھا جائے گا۔

یوں ان میں درویشی، قطعاً نہیں تھی۔ وہ شان وشوکت کے رسیا تھے۔ عرش نشین ہونا ان کا منتہائے مقصود تھا۔ وہ عمر بن عبدالعزیزؒ نہیں تھے کہ عرش سے اتر کر فرش نشین ہوگئے۔ وہ فرش سے عرش پر جانے کے قائل تھے۔ اگر فرش نشینی اختیار کرتے تو

شاید وہ پاکستان کی تقدیر بدل دیتے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ قدرت نے انہیں بہت لمبا موقع دیا لیکن اس سے وہ فائدہ نہ اٹھا سکے۔

اب پتہ نہیں کہ ان کی اس بڑی غلطی کی سزا کسے ملتی ہے کہ انہوں نے اپنے سوا کسی کو ابھرنے کا موقع نہیں دیا۔ لیڈر شپ کے جرثومے کو بھی انہوں نے قتل کر دیا۔ یہ بھی ایک قسم کا Genocide ہے۔ سیاست کی بانجھ کوکھ سے اب کون سا بطل جلیل پیدا ہوگا۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

خدا انہیں بخشے اور پاکستان کو دوام عطا ہو! آمین

سوامی رام تیرتھ

19 ستمبر 1988ء

نفی ہستی کرشمہ ہے دلِ آگاہ کا
لا کے دریا میں نہاں موتی ہے الا اللہ کا

اقبال۔ *سوامی رام تیرتھ*

میں ان دنوں اپنے اساتذہ کے ساتھ ایک رابطہ لکھ رہا ہوں۔

ڈی۔ بی ہائی اسکول دیپالپور میں میرے ایک استاد پنڈت چمن لال تھے۔ ان سے اپنا رابطہ لکھتے وقت مجھے سوامی رام تیرتھ بہت یاد آئے۔ 'رابطے' کا متعلقہ حصہ یوں ہے۔ ''.......... میرے والد اور پنڈت جی کبھی کبھی روحانیت پر بات چیت کرتے تھے جس میں مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ سوامی رام تیرتھ کے انگریزی لیکچروں کا ایک مجموعہ پنڈت جی نے میرے والد مرحوم کو دیا تھا اور گیتا بھگوت کا اردو ترجمہ بھی۔ والد صاحب مجھ سے کہا کرتے تھے کہ سوامی جی کے لیکچر پڑھو۔ دیکھو کتنی سادہ اور خوبصورت انگریزی لکھی ہے۔ دسویں میں مجھے اتنی انگریزی کہاں آتی تھی کہ میں سوامی جی کے لیکچروں سے محظوظ ہوسکتا۔ بلاشبہ نہایت سادہ انگریزی تھی لیکن مطالب اتنے گہرے تھے

کہ ان تک میری رسائی نہ ہو سکی البتہ دیباچے میں ان کی مختصر زندگی کے جو محیر العقول حالات لکھے تھے، انہوں نے مجھے بہت متاثر کیا۔ شاید اس لیے کہ ان میں افسانہ و افسوں کی پُر اسرار فضا چھائی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔''

میں وثوق سے تو نہیں کہہ سکتا لیکن اس کتاب کے آغاز میں سوامی جی کی تصویر چھپی تھی۔ چار ابرو کا صفایا اور گیروے کپڑے۔ پاؤں میں لکڑی کی کھڑاؤں۔ اب پچاس سال کی دوری سے ان کے چہرے کے خدوخال یاد نہیں آ رہے۔

ہر لیکچر کا آغاز مندرجہ ذیل فقرے سے ہوتا۔

Myself in the form of ladies and gentlemen.

ایک لیکچر میں ''تربوز'' والی حکایت بیان ہوئی تھی کہ ایک ہندوستانی، ایک ایرانی اور ایک انگریز ہم سفر تھے۔ ایک جگہ انہیں ''تربوز'' نظر آیا۔ ہندوستانی نے کہا کہ یہ ہندوانہ ہے، ایرانی بولا تربوز ہے اور انگریز نے کہا کہ تم دونوں غلط کہتے ہو'' یہ واٹر میلن ہے۔'' اس حکایت سے سوامی جی نے جو نتیجہ اخذ کیا تھا، وہ مجھے یاد نہیں۔

اسی لیکچر میں یا کسی اور لیکچر میں سوامی جی نے شاہجہاں اور اورنگ زیب کا ایک قصہ بیان کر کے اس سے کچھ نتائج اخذ کیے تھے کہ شاہجہاں نے قید تنہائی سے تنگ آ کر اورنگ زیب سے اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ وہ اپنے بچوں کو کچھ دیر کے لیے اس کے پاس بھیج دیا کرے تا کہ وہ انہیں پڑھائے اور اس کا دل لگا رہے۔ اورنگ زیب نے باپ کی یہ درخواست یہ کہہ کر رد کر دی کہ ابھی تک آپ کے دماغ سے حکومت کی بو نہیں گئی۔

لیکچروں کے اس مجموعے کے دیباچے میں لکھا تھا کہ سوامی جی نے انیس سال کی عمر میں ایم۔ اے (ریاضیات) میں اول پوزیشن حاصل کی تھی۔ کچھ عرصہ کسی کالج میں پڑھاتے رہے تھے۔ شادی بچپن میں ہو گئی تھی۔ ایک لڑکا بھی تھا۔ اچانک انہوں نے دنیا ترک کر دی درویشی اختیار کر لی۔ جنگلوں میں مجاہدہ کیا اور اتنی قوت حاصل کر لی

کہ جہاں سمادی لگا کر بیٹھتے، وہاں ان کے گرد جنگل کے درندے اور چرندے بھی ہجوم کر لیتے۔

ان میں ہرن بھی ہوتے اور شیر بھی۔ غالباً یہ بھی بیان ہوا تھا کہ برف پڑتی تو اس میں دب جاتے۔ لوگ برف کے ڈھیر سے نکالتے تو ویسے کے ویسے ہوتے۔ انتیس (29) سال کی عمر میں وفات پا گئے۔ ان کی راکھ (پھولوں) کو ایک لکڑی کی صندوقچی میں بند کر کے گنگا بہایا گیا تو صندوقچی اپنے آپ کھل گئی اور راکھ گنگا میں بہہ گئی۔

اتفاق سے ایک محفل میں ڈاکٹر وزیر آغا صاحب نے بیان کیا کہ سوامی جی نے خودکشی کی تھی جس پر میں بہت حیران ہوا۔ سلسلہ کلام یہاں تک آرتھر کونسلر اور اس کی بیوی کی مشترکہ خودکشی سے شروع ہو کر پہنچا تھا۔ آرتھر کونسلر نے محسوس کیا تھا کہ اب اس کی ذات کی تکمیل ہوگئی ہے اور مزید تخلیق کی صلاحیت باقی نہیں رہی۔ اسی لیے بانجھ زندگی سے کیا فائدہ؟ ارنسٹ ہمنگوے نے بھی اسی تخلیقی بانجھ پن سے فرار کی کوشش میں خودکشی کی تھی۔ یہ بات کچھ سمجھ میں آتی تھی لیکن سوامی جی کی خودکشی کی کوئی وجہ میرے ذہن میں نہیں آرہی۔ چنانچہ ایک عرصے سے ''سوامی جی'' میرے ذہن پر چھائے ہوئے ہیں۔ نماز پڑھتے بھی ان کا خیال آتا ہے تو میں عالم حیرت میں گم ہو جاتا ہوں۔ یہ خودکشی کیوں؟

چنانچہ میں ایک خط ڈاکٹر وزیر آغا کے نام لکھ رہا ہوں۔ یہی بات میں ان سے زبانی بھی پوچھ سکتا تھا لیکن خط میں جو کیف ہے، وہ ممکن ہے کہ زبانی بات چیت سے حاصل نہ ہوتا۔

محترمی!

تسلیم! ایک محفل میں آپ نے فرمایا تھا کہ سوامی رام تیرتھ نے خودکشی کی۔ پتہ نہیں، کیا وجہ ہے کہ اس دن سے اب تک یہ سوچ رہا ہوں کہ سوامی جی نے خودکشی کیوں کی؟ آپ سے کئی بار پوچھنا چاہا لیکن دوران ملاقات اس کا موقع ہی نہ ملا۔ میں

نے اپنے محترم استاد پنڈت چمن لال جی کے ساتھ ایک رابطے میں سوامی جی کا ذکر کیا ہے۔ یہ رابطہ اوراق میں چھپ چکا ہے۔ افسوس کہ سوامی جی کے متعلق میرا مطالعہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ ان کے انگریزی لیکچروں کا ایک مجموعہ مجھے اپنے والد محترم سے ورثے میں ملا تھا لیکن وہ گم ہوگیا ہے۔ کیا آپ کے پاس کوئی ایسی کتاب ہے، جس میں سوامی جی کی سوانح عمری بھی ہو اور لیکچر بھی؟ اگر ہو تو ضرورت مرحمت فرمائیں۔ میں محسوس کر رہا ہوں کہ سوامی جی کی روح مجھ سے اس مطالعہ کا تقاضا کر رہی ہے۔ سچ جانیے کئی بار نماز پڑھتے ہوئے بھی وہ یاد آئے۔ یوں تو میری نماز پریشان خیالیوں کا ایک پلندہ ہے کہ جن کا کوئی سر ہوتا ہے، نہ پیر تاہم سوامی جی کا یاد آنا ایک اچنبھا ضرور ہے۔

سوامی جی کی خودکشی کے بارے میں مندرجہ ذیل توجیہات میرے ذہن نے مجھے مطمئن کرنے کے لیے پیش کیں لیکن میں مطمئن نہیں ہوسکا۔

1. سوامی جی روحانی ممکنات کی اس حد تک پہنچ چکے تھے کہ جس سے آگے جانا ممکن نہیں تھا۔ اس لیے انہوں نے باقی ماندہ زندگی کو بے مصرف جان کر اس کا سلسلہ قطع کر دیا۔
2. سوامی جی ریاضت اور تپسیا کی انتہا تک پہنچنے کے بعد بھی ان بنیادی سوالات کا جواب نہ پاسکے جو ہر سوچنے والے انسان کو پریشان کرتے ہیں مثلاً اللہ کی حقیقت کیا ہے؟ دنیا کیسے وجود میں آئی؟ اس کی تخلیق کا مقصد کیا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ اس مایوسی کے عالم میں انہوں نے اپنے ہاتھوں اپنی جان لے لی۔
3. یہ بھی ممکن ہے کہ ''فلسفے'' کے وسیلے سے نہیں بلکہ 'وجدان' کے ذریعے وہ اس نتیجے پر پہنچ گئے ہوں کہ زندگی ایک بے معنی چیز ہے۔ زندگی کی ''لایقنیت'' اگر اچانک ادراک کی شکل اختیار کرے تو اس میں خودکشی ایک فطری نتیجہ ہے۔

4. یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ کسی مہلک مرض یعنی سرطان وغیرہ میں مبتلا ہوں اور اس کا علم صرف انہیں کی ذات تک محدود ہو اور وہ اس کے انتہائی مرحلے تک پہنچ کر مرنا نہ چاہتے ہوں۔

علامہ اقبال کی نظم سوامی رام تیرتھ کا ایک شعر اوپر لکھی ہوئی توجیہات میں سے پہلی کی تائید کرتا ہے۔

نفی ہستی کرشمہ ہے دل آگاہ کا
لا کے دریا میں نہاں موتی ہے الا اللہ کا

(سوامی رام تیرتھ)

یہ خط لکھ کر مجھے کچھ سکون سا ملا ہے۔ نہ جانے کیوں؟

فقط مخلص

غلام الثقلین نقوی

ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کی ساٹھویں سالگرہ

آج ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کی ساٹھویں سالگرہ ہے جو سرکاری طور پر منائی جارہی ہے۔ اگر مرحوم کی بیٹی محترمہ بے نظیر بھٹو برسر اقتدار نہ آتیں تو ذوالفقار علی بھٹو بھی تقریباً دس سال قبر میں رہنے کے بعد آناً فاناً زندہ نہ ہوجاتے۔ یوں پاکستان کے عوام کی اکثریت کے دلوں میں وہ زندہ تھے۔ واقعی؟

یوں مجھے زمانے کی منافقت پر حیرت ہوتی ہے۔ جنرل ضیاء الحق مرحوم کے دور میں کسی اخبار نے ان کا نام تک شائع نہ کیا۔ ان کے چند نہایت مخلص پیروکار شعرا کے علاوہ کسی نے ان پر کوئی نظم نہ لکھی، کل بدھ کو جنگ کا جو ادبی ایڈیشن شائع ہوا ہے، اس میں اسلامی ادیب 'حسن رضوی' نے یکا یک اپنا چولا بدل لیا ہے اور کمیونسٹ ہوگیا ہے۔ اس نے اپنے کسی شعر کا ایک مصرع یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ وہ کمیونسٹ ہوگیا

ہے، سرفہرست لکھ کر اپنا نام محبان بھٹو کی فہرست میں لکھوالیا ہے۔ مصرع یہ ہے:

لوگ کہتے تھے حسن اس کو سزا ہو جائے گی

اب آپ اس شخص کی منافقت سے خود آگاہ ہو سکتے ہیں کہ اس نے اس شعر کا پہلا مصرع کیوں نہیں لکھا۔ اس لیے کہ وہ اتنی جرأت کہاں سے لاتا۔ اشعار کا وہ مجموعہ جس کا عنوان ''خوشبو کی شہادت'' ہے، میں نے بھی پڑھا تھا۔ یہ کتاب اصغر علی چودھری نے شائع کی تھی۔

میرے نزدیک تو کوئی پاکستانی شاعر اتنا جرأت مند نہیں تھا کہ بھٹو کو واضح طور پر اپنا لیڈر مانتا۔ صرف تین شاعر ایسے تھے جنہیں میں صحیح معنوں میں بھٹو سے منسوب جانتا ہوں۔

1. شہرت بخاری
2. فخر زماں
3. اسلم گورداسپوری

یوں میں ''دیوان غالب'' سے بھی ایسے اشعار تلاش کر سکتا ہوں جن کے متعلق میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کی وفات سے متاثر ہو کر لکھے گئے ہیں مثلاً

اک خوں چکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں
پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

حسن رضوی نے اس کتاب سے جن شعرا کے اشعار منتخب کیے ہیں، ان میں ''احمد ندیم قاسمی'' کا نام شامل نہیں۔ مجھے یاد آیا کہ ان کی کوئی غزل ''خوشبو کی شہادت'' میں شامل نہیں تھی۔ پتہ نہیں، اتنے بڑے ابن الوقت شاعر نے اس موقع کو کیسے رائیگاں جانے دیا۔ یوں ان کی غزلوں میں ایسے بے شمار اشعار ہوں گے جنہیں وہ اس ثبوت کے طور پر پیش کر سکتے ہیں کہ وہ پاکستانی سیاست کے اسلامی دور میں بھی در پردہ بہت

بڑے کمیونسٹ اور ترقی پسند تھے۔

ورودِ مسعود

26 جنوری 1989ء

آج سے بارہ دن پہلے اللہ تعالیٰ نے مشیر عباس کو اولادِ نرینہ کی نعمت سے سرفراز کیا۔ مشیر عباس ان دنوں لندن میں ہے۔ اسی شب یعنی 14 جنوری کی رات کو مشیر عباس کا لندن سے فون آیا اور اسے بچے کی ولادت کی خبر دی گئی۔ یہ فون محض اتفاقی تھا ممکن ہے کہ اس کے پیچھے وہ وجدانی پر بھی ہو جسے انگریزی میں ان ٹیوشن (Intution) کہتے ہیں۔ اس بچے کے ورودِ مسعود پر بھی بہت خوشی ہوئی کہ خبر سن کر میں بے اختیار رو پڑا اور مجھے رضائی میں منہ چھپانا پڑا۔ بچہ ہسپتال میں پیدا ہوا جہاں سے عزیزم نصیر عباس نے اطلاع دی۔ میں اس وقت بستر میں لیٹا ہوا تھا۔ ممکن ہے کہ یہ آنسو اس اعصابی تناؤ (Tension) کا نتیجہ ہوں جو ایسے موقعوں پر محسوس ہوتی ہے۔ ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ پوتوں اور پوتیوں کی تعداد میں توازن قائم نہیں رہا تھا۔ اس پوتے کی آمد سے اگرچہ توازن برابر نہیں ہوا تاہم پلڑے کا جھکاؤ کم ہو گیا ہے۔ نصیر عباس کی دو بیٹیوں عقیلہ اور فضیلہ کے بعد توقع تھی کہ اللہ تعالیٰ انہیں بھائی عطا فرمائے گا۔ میمونہ کی آمد اللہ کی برکتوں میں سے ایک برکت ضرور ہے لیکن کیا کیا جائے کہ اولادِ نرینہ کی خواہش انسان کی جبلت ثانیہ بن چکی ہے۔ اب دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ عقیلہ، فضیلہ اور میمونہ کو بھی بھائی عطا فرمائے۔

محمد گوہر عباس (بچے کا نام) کی آمد سے ''ایک اور محبت'' کا اضافہ ہوا ہے۔ محبت میں کتنی وسعت ہے کہ یہ تقسیم ہو کر اور بھی بڑھتی ہے۔ اب ماشاء اللہ نظر بدُور محمد ﷺ و آلِ محمد ﷺ کے طفیل یہ محبت پانچ پوتوں، چھ پوتیوں اور چار نواسوں میں تقسیم ہو کر اور بھی بڑھ گئی ہے۔ محبت کے ساتھ پریشانیوں کی تعداد بھی بڑھتی ہے۔

22 مئی 1990ء

آج تقریباً ڈیڑھ سال بعد ڈائری کا یہ صفحہ لکھ رہا ہوں۔

اس عرصے کے دوران 18 مئی 1989ء سے 18 اکتوبر 1989ء برطانیہ کے ایک علاقے ویلز میں اپنے سب سے بڑے بیٹے ظہیر الحسن نقوی کے پاس رہا جو ایبر ایسٹ وتھ کی یونیورسٹی میں ڈاکٹریٹ کر رہا ہے۔ بیوی اور دو بچوں کو اس نے وہاں بلالیا ہے۔ اب میں سفر کی روداد لکھ رہا ہوں جو ڈائری کی صورت میں برطانیہ کے قیام کے دوران مکمل کر چکا تھا۔

جب سے واپس آیا ہوں، ملکی حالات نے پریشان کر رکھا ہے۔ ایک ریٹائرڈ آدمی کا زیادہ واسطہ ریڈیو، ٹیلی ویژن اور اخبار سے ہوتا ہے۔ یہاں کلبوں کا رواج نہیں، ادبی حلقوں میں آنا جانا صحت کے کے پیش نظر مشکل ہو چکا ہے۔ دوست ریٹائر ہر کر بکھر چکے ہیں۔ کوئی سوسائٹی نہیں لیکن ریڈیو، ٹیلی ویژن اور اخبار سے 'ہلاکت' کی خبریں زیادہ آتی ہیں۔ اخبار کا صبح صبح بہت انتظار ہوتا ہے لیکن کراچی، حیدر آباد، افغانستان اور مقبوضہ کشمیر میں جو بے گناہ مارے جا رہے ہیں، ان کی ہلاکت کی خبر سے طبیعت مردہ ہو جاتی ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ ان بے گناہ راہ گیروں کا کیا قصور تھا جو شر پسندوں کی کلاشنکوف کا لقمہ بن گئے۔ یہ لوگ جہاد کرنے تو نہیں گئے تھے۔ سب سے زیادہ لایعنی موت تو ان معصوموں کی ہے جو کسی بم کا شکار ہو جاتے ہیں۔ دو آدمی ایک دوسرے پر گولیاں برسا رہے ہوں اور ایک گولی کا نشانہ بن جائے تو میں اس موت کو 'بے معنی' نہیں کہوں گا لیکن وہ مسافر جو تیز گام کے اس ڈبے میں اپنے انجام سے بے خبر بیٹھے تھے کہ لمحے کی ایک کسر سے بھی کم عرصے میں، اُن کے پرخچے اڑ گئے، تو ان کی موت کو بے معنی نہ کہا جائے تو اس کی اور کیا تعبیر ہو سکتی ہے۔ ان دنوں پنجاب میں ریلوں میں اور چوراہوں پر بم چل رہے ہیں۔ بھاٹی چوک میں جو بم چلا اس میں ایک تیرہ سالہ لڑکا بھی ہلاک ہو گیا جو گھر جاتے جاتے ایک دکان پر دال چاول کھانے بیٹھ گیا تھا۔ کیا یہ لڑکا

افغانستان یا کشمیر کے اسلامی جہاد میں شریک ہونے آیا تھا۔ اسے دنیا نے کیا دیا؟ کیا اس کی موت کا کوئی جواز پیدا کیا جا سکتا ہے۔ منطقی، اخلاقی یا مذہبی کیا ،اُس کی موت سے دنیا کے سارے مذاہب، فلسفے، شاعری، فنون لطیفہ، الہامی کتابیں، صحیفے بے کار اور بے معنی ثابت نہ ہوئے؟ میں تو دائرے کے محیط پر حرکت کر رہا ہوں کہ کسی نقطے پر پہنچ نہیں پاتا۔

23 جون 1990ء 21 اور 22 جون کی درمیانی رات کو برادر اسلامی ملک ایران کے دوصوبوں زنجان اور گیلان میں زلزلہ آیا جس نے سینکڑوں دیہات اورشہروں کو ملبے کا ڈھیر بنا دیا۔ زلزلے کا مرکز ایک روسی شہر لینکورن کے نزدیک بحیرہ کیپین کی زیرزمین گیسوں کا جوش وخروش تھا۔کم ازکم پچاس ہزار افراد کے لیے زمین کی یہ ادنیٰ سی کروٹ قیامت بن گئی۔ ابھی تک ملبے سے لاشیں نکالی جارہی ہیں۔ دنیا کے ہر ملک نے اس مشکل وقت میں ایران کی مدد کی ہے۔

اس زلزلے کو ایک ''آفت نا گہانی'' کا نام دیا جاسکتا ہے۔

یہاں تک میرا مطالعہ قرآن میرا ساتھ دیتا ہے، قرآن میں ایک دو زلزلوں اور چیخوں کا ذکر ہے۔ جو قوم لوطؑ اور قوم عاد وثمود پر عذاب کی صورت میں آئے۔ ان زلزلوں کے پیچھے مشیت الٰہی کام کر رہی تھی۔ ان کی توجیہہ ہوسکتی ہے اور انہیں بے معنی نہیں کیا جاسکتا۔

لیکن ایران میں جو زلزلہ آیا ہے، اس کی کوئی توجیہہ نہیں ہوسکتی۔ اس وقت پوری اسلامی دنیا میں صرف ایران ہی ایک ایسا ملک ہے جہاں کے لوگ اسلامی شعار کے مطابق زندگی بسر کر رہے ہیں اور جنھوں نے لاتعداد قربانیاں دے کر ایران میں اسلامی نظام لیا ہے۔ باقی مسلمان ملک صرف زبانی دعووٴں کے ساتھ اسلام سے اپنی وابستگی کا اظہار کر رہے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ کوئی معاشرہ 'گناہ' سے خالی نہیں ہوسکتا، کج روی انسان کی فطرت میں ہے، تاہم دیکھنا یہ ہے کہ کون سا معاشرہ اس بنا پر عذاب کا

مستحق ہے اور کون سا ثواب کا۔

مجھے اس مسئلے نے بہت پریشان کر رکھا ہے۔ ایک ہفتے سے میں ایک ذہنی کرب میں مبتلا ہوں۔ بلاشبہ میں 'مسلمان' ہونے کے باوجود 'ایمان' کی دولت سے مالا مال نہیں۔ الیقین کی منزل پر نہیں پہنچا تاہم میری کوششیں یہی رہی ہے کہ قرآن اور سنت اور حدیث نبوی سے تمسک قائم رکھوں۔ منطق کہتی ہے کہ ''کائنات'' اتنی سادہ نہیں کہ ''اکوں الف تینوں درکار'' کے فلسفے سے اس کی گتھی حل ہوسکے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ آزمائش ہے جس کی خونیں منزلوں سے امریکہ بھی گزر سکتا ہے اور ایران بھی لیکن مجھے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ زندگی 'لایعنی' چیز ہے اور اس کے کوئی اصول و قواعد نہیں۔ چونکہ پیدا ہوکر ایک خاص مدت تک زندہ رہنا لازمی ہے، اس لیے مذہب یا فلسفے کے بغیر یہ کٹھن سفر طے نہیں ہوسکتا۔

25 جولائی 1990ء (2 محرم الحرام 1411ھ)

ان دنوں دمے کی تکلیف بہت بڑھ گئی ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ موسم میں حبس بہت ہے۔ میرا دمہ پرانے نزلے زکام کی دین ہے جسے انگریزی میں (Chronic Bronchites) کہتے ہیں۔ سانس کی نالیاں تنگ ہوگئی ہوں اور یہ جب بلغم سے اٹ جاتی ہیں تو دمے کا دورہ پڑ جاتا ہے۔ جدید سائنس کا کمال ہے کہ اس نے دمے کے دورے میں فوری افاقے کے لیے بہت سی دوائیاں ایجاد کر لی ہیں۔ سب سے زیادہ مفید وینٹولن کا ان ہیلر ہے۔ اس کے ایک دوکش لینے سے افاقہ ہو جاتا ہے ورنہ دمے کے دورے میں مریض کا بُرا حال ہوتا ہے۔

کل علی الصبح سینے پر بوجھ سا محسوس ہوا۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ سانس کی نال سے گھیس گھیس کی آواز نکلنے لگی۔ نالیوں میں پھنسی ہوئی بلغم نے ہوا کا راستہ روک لیا۔ آکسیجن کی مناسب مقدار پھیپھڑوں کو نہ ملی تو یوں لگا جیسے پانی میں ڈوب رہا ہوں اور

منوں بلکہ ٹنوں پانی کا بوجھ میرے سر پر ہے۔ میں نے سرہانے پڑے ان ہیلر کو نکالا اور اس کا ایک کش لیا۔ چار پانچ لمحوں کے اندر اندر پھیپھڑوں میں کشادگی کا احساس ہوا۔ اس لمحے جس سکون سے میں آشنا ہوا۔ اس کی کمیت و کیفیت اور قدر و قیمت کچھ میں ہی جانتا ہوں اور اس لمحے کا کرب بھی مجھے بھی معلوم ہے جو دمے اور ان ہیلر کے کش کے درمیان وارد ہوا۔ صرف ایک لمحہ مجھے ایسا لگا جیسے میں مر رہا ہوں اور زندگی اور موت کے درمیان صرف ایک سانس کا اذیت ناک وقفہ ہے۔ پھر خیال ہوا کہ ڈوبنے والے کی موت کتنی اذیت ناک ہوتی ہوگی اور اس کی بھی جس کا دم گھٹ رہا ہو۔ اس سال حج کے دوران 1426 حاجی منیٰ کی سرنگ میں دم گھٹنے سے جاں بحق ہوگئے وہ لوگ جو حج کی سعادت سے بہرہ ور ہو کر اپنی روح کو جلا اور زندگی بخشنا چاہتے تھے، پورے مناسک حج ادا نہ کر سکنے کے باعث کس قدر اذیتِ روحانی سے دوچار ہوئے ہوں گے۔

ان دنوں میں برانکوسپزم (Broncospasm) کے خوف میں مبتلا رہتا ہوں۔ چونکہ پنجابی ایک ضرب المثل کے مطابق ''دمہ دم نال'' ہے۔ اس لیے موت تک یہ میرا مستقل ساتھی ہے، یہ اچھا ساتھی نہیں۔ اس سے کسی فیض کی توقع نہیں۔ میں سوچتا ہوں۔ اگر موت دمے سے واقع ہوئی تو کس قدر اذیت ناک ہوگی۔ میرا یہ ساتھی عفریت بن کر میرا گلا گھونٹنے لگے گا اور میں اس کے سامنے بے بس ہوں گے۔

کل بعد دوپہر ان ہیلر کا ایک کش لے کر غسل خانے میں گیا تو یوں لگا جیسے گرم حمام میں آ گیا ہوں۔ غسل خانے میں اس سے قبل گھر کے دو تین فرد نہا چکے تھے۔ اندر بہت حبس تھی۔ یوں لگا جیسے بھاپ اٹھ رہی ہو۔ پانی کا ایک مگ سر پر ڈالا تو وہی ڈوبنے کی کیفیت کا احساس ہوا۔ بدن پر پانی کے لمس نے جو خنکی کا احساس پیدا کیا تھا، وہ یکدم غائب ہوگیا۔ قدرے توقت کے بعد ایک مگ اور پانی کا جسم پر ڈالا۔ صابن نہ لگا سکا۔ ایک مگ اور دوسرے مگ کے درمیان پانی میں ڈوبنے اور ڈوب کر ابھرنے کی کیفیت تھی۔ جسم کو پانی سے چپڑ کر تہمد باندھا۔ غسل خانے کا دروازہ کھولا اور اپنی بیٹی

سے کہا ''ان ہیلر!'' ان ہیلر کا کش لیا تو سانس بحال ہوا۔ جس نامعلوم شخص نے ان ہیلر ایجاد کیا تھا، اس کے لیے دعائے خیر کی۔ انسانیت کا کتنا بڑا محسن ہے۔

معلوم نہیں کہ موت کے وقت ان ہیلر بھی کام دیتا ہے یا نہیں۔ کاش مرحوم قیوم نظر سے پوچھنے کا موقع ملتا۔ ایک صاحب کا قول ہے کہ کوئی شخص دمے سے نہیں مرتا۔ واقعی یہ درست ہے تو خالق موت و حیات کا انسان پر یہ بہت بڑا کرم ہے کہ اسے آسانی سے مرنے کے موقع عطا فرماتا ہے۔ میں تو ہر نماز میں یہی دعا کرتا ہوں کہ موت آسان ہو۔ میں نے اپنے والد صاحب اور ماموں صاحب کو مرتے ہوئے دیکھا ہے۔ آپ مجھے یہ تو پتہ نہیں کہ نزع کے عالم میں ان پر کیا گزری ہوگی لیکن بظاہر ان کی موت نہایت پرسکون تھی۔ سانس لینے میں اگر کوئی دقت ہوتی تو وہ ان کے چہرے سے عیاں ہوتی۔

ڈاکٹر وحید قریشی کو مجھ سے بھی زیادہ دمے کی تکلیف ہے لیکن وہ اپنے معمولات زندگی کو باحسن طریقہ سرانجام دیتے ہیں۔ ان پر جب بران کائیٹس کا دورہ پڑتا تو کئی کئی دن صاحب فراش رہتے ہیں۔ وینٹولین کا علاج ان پر کارگر نہیں ہوتا۔ وہ اس منزل سے آگے نکل گئے ہیں۔ اب بھی وہ ''بزم اقبال'' کے ڈائریکٹر ہیں۔ بہت بڑے تن و توش کے ساتھ بھی وہ خاصے ''موبائل'' ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہیں کار کی سہولت حاصل ہے۔ کار سے اترتے ہی دمہ انہیں آلیتا ہے اور چند قدم چلنا بھی انہیں دوبھر معلوم ہوتا ہے۔

پروفیسر محمد منور مرزا بھی دمے کے مریض ہیں۔ اقبال شناس مشہور ہیں۔ ہم پندرہ سال گورنمنٹ کالج لاہور کے شعبہ اُردو میں رفیق کار رہے۔

29 جولائی 1990ء

پروفیسر منور میرزا مسلم لیگی ہیں اور نہایت سخت دل رائٹسٹ۔ اس میں کوئی

شک نہیں کہ وہ ''پاکستان'' (یعنی قائداعظمؒ کے پاکستان) کے عاشق ہیں۔ جب ذوالفقار علی بھٹو مرحوم (ادھر تم، ادھر ہم) کے نعرے پر برسراقتدار آئے اور ان کے آنے سے پہلے بنگلہ دیش وجود میں آ گیا، تو پروفیسر منور مرزا پاکستان کی اس شکست کا ذمے دار انہیں اور صرف انہیں جانتے تھے۔ صابر لودھی اور میں ان سے متفق نہیں تھے۔ (اب میں مرزا صاحب سے متفق ہوں) کہ ذوالفقار علی بھٹو نے پاکستان کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔ انہیں دنوں پروفیسر صاحب کو دمہ ہوگیا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ ذوالفقار علی بھٹو اور اس کے دور حکومت کی 'گھٹن' نے مجھے 'دمہ' کر دیا۔ انہیں دنوں ہم انٹر کے کورس میں مومن کی ایک غزل پڑھایا کرتے تھے جس کا ایک شعر کچھ عجیب المعانی محسوس ہوتا تھا۔

نارسائی سے دم رُکے تو رُکے
میں کسی سے خفا نہیں ہوتا

''دم رکنے'' اور ''خفا ہونے'' میں جو قرینہ ہے، وہ ہماری سمجھ میں نہ آتا تھا۔ جب پروفیسر مرزا منور نے گھٹن اور غم و غصے کو 'دمے' کا باعث قرار دیا تو یہ معنی فوراً میرے ذہن میں واضح ہوگئے۔

مجھے پہلی بار 'دمے' کا احساس رحمٰن مذنب نے کرایا۔ یہ 1981ء کی بات ہے۔ جنرل ضیاء الحق پاکستان پر اپنا قبضہ مضبوط بنا چکے تھے۔ 1980ء اکتوبر میں میرا چھوٹا بھائی جواد حیدر نقوی بھی وفات پا چکا تھا جس کا مجھے صدمہ تھا۔ جنرل موصوف کے مارشل لا نے اگرچہ مجھے ذاتی طور پر کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا تاہم اس مارشل لا سے مجھے قطعاً اتفاق نہیں تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو کے پھانسی پانے سے بھی مجھے بہت سے خطرات قوم کے سامنے نظر آتے تھے لیکن گھٹن کے کسی احساس سے مجھے کوئی سابقہ نہ پڑا۔ 'دمہ' ممکن ہے، پہلے سے ہو لیکن جب اس کا عرفان حاصل ہوا، تو گھٹن اور خفگی کی کیفیت خود بخود پیدا ہوگئی۔ بہرحال مرزا منور کا دمہ 'سوشلزم' کے دور میں ظاہر ہوا اور میرا

دمہ ''اسلامائزیشن'' کی دین تھا۔ نہ بھٹو سوشلزم نافذ کرسکے اور نہ ضیاء الحق اسلام۔ دونوں 'منافق' ثابت ہوئے اور میرا دمہ مردمومن۔

مرزا منور اور میں 1983ء میں چند مہینوں کی کمی بیشی سے ریٹائر ہوئے۔ وہ اگر ریٹائرمنٹ سے پہلے ایک لاکھ کے تھے تو ریٹائرمنٹ کے بعد سوا لاکھ کے ہوگئے۔ ملازمت کے دوران میں وہ 'اقبال چیر' پر براجمان ہوئے۔ پھر اقبال اکادمی کے چیئرمین مقرر ہوئے اور یہیں سے فارغ ہوئے تو کینیڈا چلے گئے۔ وہاں پاکستان کے موضوع پر لیکچر دے۔ ایک عرصے سے ان سے ملاقات نہیں ہوئی لیکن 'دمہ' ان کا برقرار ہے۔ اب ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کی بیٹی پاکستان کی 'حاکمہ' ہیں۔ ان کے 'دمے' میں اضافہ ضرور ہونا چاہیے۔ میرے دمے نے تو دن دگنی رات چوگنی ترقی کی ہے، بم کے دھماکے، حیدرآباد اور کراچی کے قتل عام، دہشت گردوں کی بلاخوف و خطر معصوم اور بے گناہ انسانوں کی خون ریزی، مقبوضہ کشمیر میں حریت پسندوں کی بغاوت اور اس کے صلے میں پاکستان پر ہندوستان کے حملے کا خدشہ، ان کی وجہ سے 'زندگی' پر یقین اٹھ سا گیا ہے۔ حفاظت (security) کا احساس ختم ہوگیا ہے اور جمہوریت کے نام پر جو بے انصافیاں اور لوٹ کھسوٹ ہورہی ہے، اس سے .... 'جمہوریت' پر بھی ایمان جو پہلے ہی کمزور تھا آپ معدوم ہوگیا ہے۔ رات ٹی وی سے خبریں سننے اور صبح اخبار پڑھنے کے بعد اپنی بے بسی اور بے کسی کا احساس شدید ہوتا ہے تو 'دم گھٹنے' کی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے۔ شاید اسی غم و غصے نے دمے کو زیادہ شدید کردیا ہے۔ ضیاء الحق مرحوم اسلام کا نام لیتے تھے تو میرا دم گھٹتا تھا۔ اب بے نظیر بھٹو، عوام، کا نام لیتی ہیں تو گلے پر کوئی آہنی ہاتھ اپنی گرفت مضبوط کرلیتا ہے کیونکہ مجھے دونوں جھوٹے معلوم ہوتے ہیں اور جھوٹ بھی وہ کہ برملا ہمارے منہ پر بولا جارہا ہے۔ اسی لیے تو میں دمے کو مومن کہتا ہوں۔

بیماری کوئی بھی ہو اچھی نہیں ہوتی۔ بیمار آدمی خود بھی مایوس ہوتا ہے اور دوسروں کو بھی مایوس کرتا ہے۔ وہ اپنے لواحقین کے لیے ایک آزمائش بن جاتا ہے۔ لمبی

بیماری میں تو اولاد بھی اس سے تنگ آ جاتی ہے۔ میں اپنی مثال دیتا ہوں۔ میری والدہ حیات ہیں لیکن بڑھاپے کی وجہ سے قریب قریب معذور۔ میری عمر اڑسٹھ سال کی ہے۔ میری بیوی مجھ سے زیادہ نحیف ونزار ہے۔ اب بتائیے کہ میں اس عمر میں والدہ کی کیا خدمت سرانجام دے سکتا ہوں کہ خود دوسروں کا محتاج ہوں۔ والدہ گاؤں میں میرے چھوٹے بھائی رفیق حسین کے پاس رہتی ہیں۔ ان کی عمر چھیاسٹھ سال کی ہے اور ان کے گھٹنوں میں درد رہتا ہے۔ وہ کہہ رہے تھے ''بھائی جان! والدہ کی خدمت میں بڑھاپے کی وجہ سے ذرا کمی ہوتی ہے تو میں سوچتا ہوں کہ میں ازروئے فرمان قرآن گناہ گار ہو رہا ہوں۔ قرآن کا حکم ہے کہ والدین کے سامنے اُف بھی نہ کرو۔ میں ان کی کوئی خدمت بجا لانے کے لیے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھتا ہوں تو میری اُف نکل جاتی ہے۔ میں گناہ گار ہوا یا نہیں؟''

میں اسے کوئی جواب نہیں دے پاتا کیونکہ جب دمے کا دورہ پڑتا ہے تو میں دو قدم چل کہ خود 'ان ہیلر' بھی نہیں اٹھا سکتا، والدہ کے حکم کی تعمیل کیا کروں گا۔

اب جب میں یہ سطور لکھ رہا ہوں، میں ٹھیک ٹھاک ہوں۔ سانس ٹھیک چل رہا ہے۔ لکھنے کو جی چاہ رہا ہے۔ جب دورہ پڑے گا تو اپنا ہی لکھا ہوا اچھا نہیں لگے گا۔ کل شام دورہ پڑا تو میری سب سے چھوٹی 'پوتی' (دو سال عمر) میرے ساتھ لاڈ پیار کر رہی تھی۔ جب اس عفریت کا ہاتھ میرے گلے پر پڑا تو میں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور ان ہیلر کی طرف جھپٹا دو کش لینے پر افاقہ ہوا۔ میں نے 'پوتی' کو بلایا لیکن وہ میرے قریب نہ آئی۔ بیماری کتنی رشتہ کش ہوتی ہے کہ دورہ پڑا ہو تو اپنے سوا کوئی اور نظر ہی نہیں آتا۔

عبداللہ حسین نے ایک ناول ''باگھ'' کے عنوان سے لکھا ہے۔ میں نے بھی پڑھا ہے۔ اس کا مرکزی کردار ایک نوجوان ہے جو 'دمے' کا مریض ہے۔ ناول کے پہلے صفحے پر ایک مشہور ڈاکٹر کا 'دمے' کے متعلق ایک تحقیقی پیراگراف ہے۔ ''باگھ'' دمے

کی علامت ہے۔ اس نوجوان پر جب بھی دمے کا دورہ پڑنے والا ہوتا ہے، وہ باگھ کی دھاڑ سنتا ہے۔ یہ کیفیت مجھ پر کبھی وارد نہیں ہوئی۔ میں تو یوں محسوس کرتا ہوں (جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں) کہ میرے سر ٹنوں پانی کا بوجھ پڑ گیا ہے اور میں ڈوب رہا ہوں۔

21 دسمبر 1990ء

پرسوں یعنی 19 دسمبر کی رات کو آقائے صادق گنجی کو قتل کر دیا گیا۔ آقائے صادق گنجی گذشتہ ساڑھے تین سالوں سے خانہ فرہنگ ایران لاہور کے ڈائریکٹر تھے۔ اب وہ فارغ ہو کر واپس ایران جا رہے تھے۔ آقائے صادق گنجی 27 سال کے نوجوان تھے۔ گزشتہ ایک ہفتے سے وہ الوداعی دعوتوں میں شریک ہو رہے تھے۔ وہ کل رات شاہراہ قائداعظمؒ پر واقع انٹرنیشنل ہوٹل میں ایک محفل میں شریک ہونے کو گئے۔ ہوٹل کے پورچ میں رات تقریباً سات بج کر پینتیس منٹ پر وہ جب کار سے باہر نکلے تو تڑتڑ گولیاں چلنے کی آواز آئی اور پھر لوگوں نے دیکھا کہ صادق گنجی اور ان کے ساتھی مکرام عبادی زمین پر خون میں لت پت تڑپ رہے تھے۔ ہسپتال پہنچنے سے پہلے پہلے وہ دم توڑ گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

کل ان کا جنازہ خانہ فرہنگ ایران کے لان میں ہوا۔ وزیراعظم نواز شریف اور گورنر پنجاب میاں محمد اظہر جنازے میں شریک ہوئے۔ میاں محمد اظہر جنازے کے ساتھ ایران گئے۔

آقائے صادق گنجی نہایت صلح پسند اور سنی شیعہ اتحاد کے حامی مسلمان تھے۔ لاہور کے سوشل حلقوں خاص کر ادبی حلقوں میں وہ بہت مقبول تھے۔ جماعت اسلامی کے سید اسعد گیلانی اور مفتی محمد حسین نعیمی ان کے دوستوں اور بہی خواہوں میں شامل تھے۔

قاتل نے خودکشی کی کوشش کی لیکن قرطبہ چوک سے زخمی حالت میں پکڑا گیا۔ ابھی تک قتل کے محرکات کا پتہ نہیں چل سکا۔

یہ ہے خلاصہ ایک نہایت صالح، مرنجان مرنج، مقبول، ہر دلعزیز، وسیع النظیر اور وسیع القلب نوجوان کے قتل کی روداد کا۔ قاتل نے ایک باغ و بہار انسان کو خاک و خوں میں ملا دیا اور ہنستا بستا گھر اجاڑ دیا۔ کیوں؟

پاکستانی یزیدیت کا ایک اور شکار

پہلا شکار حسینیؒ مرحوم تھے

28 جنوری 1991ء

دو جنونیوں میں جنگ ہورہی ہے اور ہلاک ہو رہے ہیں معصوم بوڑھے ، جوان اور بچے، عورتیں اور مرد کہ جنہیں نہ جنگ کی خواہش تھی اور نہ وہ جنگی جنون میں مبتلا تھے۔ صدام حسین جنونی نے دس سال ایران کو اپنے جنون کا شکار بنایا اور اس کا حاصل؟ .... لاکھوں لوگ ہلاک ہوئے۔ ہزاروں معذور۔ یتیموں اور بیواؤں کا کچھ شمار نہیں اب اس نے کویت پر بلا جواز قبضہ کیا۔ ساری دنیا نے اس کی منت سماجت کی کہ وہ کویت پر سے اپنا قبضہ اٹھا لے لیکن اس جنونی کی 'انا' نے واپسی قبول نہ کی۔ چنانچہ ایک اور جنونی مسٹر بش کو موقع مل گیا کہ ایشیا کو میدان جنگ بنا کر اول الذکر جنونی کو شکست دے۔ اس قاتل اور مجرم قوم کے سربراہ نے جو کبھی سی آئی اے کا سربراہ تھا اور اور جس کے دامن پر بہت سے معصوم خون کے دھبے ہیں، اپنی ساری وار مشینری کو وسط ایشیا میں جمع کر دیا۔ سعودی عرب کے عیاش حکمرانوں کو ''صدام'' اپنے تخت و تاج کا دشمن نظر آیا تو انہوں نے ''بش'' کے حضور میں سر جھکا دیا اور دامے، درمے اور قدمے اس کی مدد کی۔ دنیا کا ہر استعماری ملک ''بش'' کی فوج میں شامل ہوگیا، فرانس، برطانیہ، اٹلی، آسٹریلیا............ ان سب کے ظلم و ستم کا نشانہ 'عراق' ہے۔ سعودی عرب کی فضائیہ

پہلی بار کسی جنگ میں شریک ہوئی ہے۔ ترکی، مصر اور پاکستان بھی اس ''کارِ خیر'' میں شریک ہے اگرچہ پاکستانی حکومت کا موقف ہے کہ اس نے اپنی فوج ''حرمین شریفین'' کے دفاع کے لیے بھیجی ہے۔

دو یزید لڑ رہے ہیں۔ ان کی وجہ سے پوری دنیا مصائب کی لپیٹ میں آ رہی ہے۔ روس غیر جانبدار ہے کیونکہ وہ اس وقت ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے۔ دنیا کا کوئی ملک صدام حسین کی حمایت نہیں کر رہا۔ چند غیر جانبدار ملک بھی غنیمت ہیں۔

17 جنوری کو صبح 5 بجے یہ جنگ شروع ہوئی۔ اب تک عراق کے شہروں پر بائیس ہزار فضائی حملے ہو چکے ہیں۔ لاکھوں ٹن بارود اس چھوٹے سے ملک پر گرایا گیا ہے۔ یقینی طور پر تو معلوم نہیں ہو سکا لیکن اندازہ ہے کہ اب تک تین لاکھ عراقی شہید ہوگئے ہیں۔ جن شہروں پر بمباری کے دھماکے اور آگ کے شعلے چالیس کلومیٹر دور ایران کے خرم شہر میں سنائی دیں اور دکھائی دیں اور جن کی وجہ سے خرم شہر کی عمارتیں کانپ جائیں، ان کے رہنے والوں کا کیا حال ہوگا۔ اتنے دھماکے سن کر تو پہاڑوں کے دل دہل جاتے ہیں۔ انسان کا دل تو نازک سا آبگینہ ہے۔ پتہ نہیں کتنے دل چکنا چور ہوگئے ہوں گے۔ میں لاہور میں بہت دور ہوں لیکن مظلوم انسانوں کی چیخیں مجھے سنائی دے رہی ہیں۔ 1965ء اور 1971ء کی جنگوں کے دھماکے ان کے مقابلے میں ایک سرگوشی سے بھی کم درجہ رکھتے ہیں۔

لیکن اس گھٹن کے عالم میں میرا دمہ بڑھ گیا ہے!

صحرائی یزید ابھی ہار نہیں مان رہا۔

لیکن دنیائے اسلام کے عوام اب 'عراق' کے حامی ہوگئے ہیں۔ شہر شہر جلوس نکل رہے ہیں اور صدام حسین ہیرو بن گیا ہے۔ اس نے اسرائیل پر چند سکڈ میزائل پھینکے ہیں۔ امریکہ اسرائیل کو جنگ میں شریک ہونے سے روک رہا ہے۔

فضائی جنگ میں صدام حسین نے ہار نہیں مانی۔ زمینی جنگ میں نام نہاد

اتحادیوں کو بہت خوف ہے۔ یقیناً ان کے بھی ہزاروں جوان خاک وخوں میں غلطیاں ہوں گے۔

اس جنگ کا بدیہی نتیجہ یہ ہوگا کہ امریکہ خلیج کے تیل پر قابض ہو جائے گا۔ اسرائیل کومزید قوت حاصل ہوگی۔ امریکہ، کا اسلحہ خرچ ہوگا اوراس کی قیمت سعودی اور کویتی حکمران ادا کریں گے۔ پھراس کے اسلحے کے کارخانے مزید اسلحہ بنائیں گے اور دنیا کو ہر لمحے کسی خونی جنگ میں مبتلا رکھیں گے کہ اسلحہ بکتا رہے۔

مسلمان کو مارا جارہا ہے اور مسلمان ہی اس کے قتل کے لیے امریکہ کوسرمایہ مہیا کررہا ہے۔ اس وقت تک سعودی عرب اور کویت اربوں ڈالرامریکہ کی نذر کر چکے ہیں۔ امریکی بنیا اپنی سپریمیسی کی عمارت مسلمانوں ہی کے سرمائے اوراسی کے خون سے استوارکررہا ہے۔

جب عمارتیں گر رہی ہوں، دھاکوں سے پہاڑ لرز رہے ہوں، آگ کے شعلے انسان کوخس و خاشاک کی طرح کھا رہے ہوں۔ تو اس وقت اس تجربے سے گزرنے والے انسان کے لیے قیامت نہیں تو اور کیا ہے اوراس قیامت کے ذمہ دار وقت کے دو یزید ہیں۔ بش اور صدام...... ابھی تک تو کوئی حسینؑ نظر نہیں آرہا۔ ان دو یزیدوں کے استبداد اور ظلم وستم کو اپنے پاؤں تلے کچل سکے!

2 مارچ 1991ء

آخر فرعون (بش) نے یزید (صدام) کو کچل دیا۔ اگر یہ صرف صدام کی شکست ہوتی تو مجھے کوئی افسوس نہ ہوتا۔ ایک فرعون نے چنگیز کی طرح مسلمانوں پر حملہ کیا اور ایک ملک کو تباہ برباد کر دیا۔ اس شکست کی ذلت میں اپنے دل میں محسوس کررہا ہوں۔

(I feel humiliated) یعنی عراق میں کم از کم ایک لاکھ مسلمان ہلاک

ہوئے۔ امیر کویت کی بادشاہت بحال ہوگئی اور شاہ فہد کی استبدادی شہنشاہیت کو ایک اور سہارا مل گیا لیکن یہ غداری انہیں مہنگی پڑے گی۔ اسرائیل اب مشرق اوسط کا سب سے بڑا طاقتور ملک بن جائے گا۔ خلیج کی فضا آلودہ ہوگئی ہے۔ تیل کے کنویں تباہ ہوگئے ہیں۔ فضا کی آلودگی برسوں تک اس خطے میں بسنے والے لوگوں کو متاثر کرتی رہے گی۔

صدر بش نے کہا ہے "ویتنام کی شکست نے امریکی نفسیات پر جو برا اثر ڈالا تھا، وہ عراق میں اس کی فتح سے ختم ہوگیا ہے۔"

اقوام متحدہ اب عراق کو مزید ذلیل کرنے پر آمادہ ہے۔

یہ شکست دنیا کے تمام مسلمانوں کے لیے صرف شرمندگی ہی کا باعث نہیں بلکہ آئندہ ان کی ذلت کا دروازہ بھی اس سے کھل گیا ہے۔

26 مارچ 1991ء

پاکستان اکادمی ادبیات کی طرف سے پندرھویں صدی ہجری کی بہترین کتابوں کے لیے ایوارڈز کا اعلان کر دیا گیا ہے۔ اخبار سے واضح نہیں ہوا کہ یہ کن ھجری سالوں کی کتابوں پر دیا گیا ہے۔ کل رات ٹیلی ویژن پر بھی یہ خبر سنی تھی۔ خبر میں عیسوی سالوں کا ذکر تھا۔ بہرحال انہیں سالوں میں میری کتاب "ارض تمنا" بھی چھپی تھی۔ مجھے اس کتاب پر انعام ملنے کی اعشاریہ ایک فی صد بھی امید نہیں تھی۔ تاہم میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔ آج تفصیل پڑھ کر خاصا دکھ بھی ہوا۔ ایسا لگا جیسے گذشتہ پچاس سالوں میں جو ادبی کام کیا ہے، اس پر خط تنسیخ پھر گیا ہے لیکن ڈاکٹر انور سدید کو "اردو ادب کی تحریکیں" پر ایوارڈ ملنے سے اس دکھ کا کچھ مداوا بھی ہوگیا۔

پھر سوچا کہ کیا یہ ایوارڈ واقعی کتاب کے میرٹ پر دیے گئے ہیں؟ کیا اس میں صوبائی، لسانی اور سیاسی عوامل نے کام نہیں کیا؟ مجھے کیا معلوم! یہی سمجھنا چاہیے کہ میری کتاب میرٹ کے معیار پر پوری نہیں اتری!

عصمت چغتائی اور خواجہ احمد عباس کی وصیتیں

21 نومبر 1991ء

یہ عنوان میں نے 'نوائے وقت' مورخہ 21 نومبر 1991ء (جمعرات) کے کالم ''تازہ بہ تازہ'' سے لیا ہے۔ کالم نگار کا قلمی نام ''بھیدی'' ہے۔

اردو کی مشہور ترقی پسند اور باغی خاتون افسانہ نگار عصمت چغتائی کا گذشتہ ہفتے انتقال ہو گیا ہے۔ ان کی وصیت کے مطابق ان کی لاش کو جلا دیا گیا ہے۔ معلوم نہیں کہ ان کی خاک 'گنگا برد' بھی کی گئی ہے یا نہیں البتہ یہ خبر پڑھی ہے کہ ان کے بھائی مرزا علیم بیگ نے ان کا فاتحہ درود اسلامی طریقے سے کیا ہے۔ فاتحہ دُرود کا مقصد یہ ہے کہ مرنے والے کو ثواب پہنچے اور اس طرح اس کی بخشش کا سامان ہو۔ نوائے وقت کے ایک کالم ''سرراہے'' میں نامعلوم کالم نگار نے کہ جو میری تحقیق مطابق پروفیسر محمد سلیم ہیں، اس پر نہایت اچھا تبصرہ لکھا ہے۔ اس وقت وہ کالم میرے سامنے نہیں۔ اس کا لب لباب یہ ہے کہ ایک مشہور صوفی حضرت غوث علی شاہ نے تذکرہ غوثیہ میں ایک واقعہ لکھا ہے۔ ان کی رضاعی ماں ایک ہندو خاتون تھیں۔ حضرت غوث علی شاہ نے اپنی مرحومہ اصلی ماں کے لیے حج ادا کیا تو آں جہانی رضاعی ماں کے لیے گنگا میں اشنان کر کے اس کی روح کو ثواب پہنچایا۔ پوچھنے والے کو بتایا کہ میری رضاعی ماں ہندو تھیں۔ اس لیے انہیں ہندووانہ رسم کی ادائیگی ہی سے ثواب مل سکتا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

''تازہ بہ تازہ'' کا کالم نگار لکھتا ہے ''گذشتہ دنوں عصمت چغتائی کا انتقال ہوا تو ان کی وصیت کے مطابق دفنانے کی بجائے جلایا گیا جس پر بھارت کے'' سیکولر (Secular) حلقے میں بغلیں بجائی جارہی ہیں جب کہ مسلم حلقے اس پر سخت چیں بجبیں ہیں۔ عصمت چغتائی مر گئیں اور اپنی وصیت کے مطابق جلائی گئیں، اس لیے کہ وہ سیکولر تھیں۔ وہ جس نے ساری عمر مسلمانوں کے دلوں کو جلایا، اس نے اپنی لاش کو جلانا بطور

انعام یا بطور سزا قبول کیا۔

مرنے کے بعد انسان کے ساتھ کیا ہوگا، یہ تو خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ آج تک مرنے کے بعد کوئی زندہ نہیں ہوا کہ بتا سکے کہ آیا مرنے کے بعد کوئی نئی زندگی ہے بھی یا نہیں۔ اس عقیدے پر تو ایمان بالغیب کی ضرورت ہے۔ یوں انسانوں کی اکثریت کا ایمان یہی کہتا ہے کہ مرنے کے بعد زندگی کا ابدی دور شروع ہوتا ہے۔ یہ عقیدہ انسان کا آرکی ٹائپ لاشعور بن گیا ہے۔ یقیناً عصمت چغتائی اس عقیدے کو ڈھکوسلا جانتی ہوں گی ورنہ وہ اپنے مذہب کے مطابق دفن ہونے کی وصیت کرتیں۔ میں حیران ہوں کہ اگر حیات مابعد الموت واقعی ایک حقیقت ہوئی تو اس کے ساتھ ''جزا و سزا'' کا تصور بھی یقیناً ایک حقیقت ہوگا۔ تو کیا سزا کا خوف ان کے دل میں جاگزیں تو نہیں تھا کہ خاک سیاہ ہوکر مر مٹنے کو انہوں نے دفن ہونے پر ترجیح دی۔ یوں دفن ہونے کے بعد بھی تو گوشت پوست اور ہڈیاں خاک ہی تو بن جاتی ہیں۔

وہ جس نے کائنات کے اسرار پر سے بہت کم پردہ اٹھایا ہے یا اٹھنے دیا ہے، وہی اسے بہتر جانتا ہے۔ حکیم الامت مولائے کائنات حضرت علیؑ سے کسی دہریے نے ایسے ہی شکوک کا اظہار کیا تھا۔ انہوں نے فرمایا کہ مرنے کے بعد دو ہی صورتیں ممکن ہیں یا تو حشر نشر ہوگا اور انسان کو اس کے اعمال کے مطابق عذاب و ثواب ملے گا یا اس زندگی کے بعد دوسری زندگی نہیں ہوگی۔ نہ ہوئی تو پھر میں اور تم دونوں برابر۔ اگر ہوئی تو میں تم سے فائدے میں رہوں گا۔ یہ ایک منطقی جواب تھا۔ دہریہ خاموش ہوگیا۔

میں سوچتا ہوں کہ اگر واقعی انسان کی زندگی اس کی عمر مستعار تک محدود ہوئی تو ان اعتقادات کا کیا بنے گا جو زندگی میں امن وسکون، خوبصورتی اور راحت و عافیت کا سامان مہیا کرتے ہیں۔ اس سوچ پر مرا دم گھٹنے لگتا ہے کہ سورج، چاند، پہاڑ، وادیاں، باغ اور پرندے اور ان کے نغمے گو یا دنیا کی ہر خوبصورتی بے کار چلی گئی۔ پھر اس کائنات کے وجود میں آنے کا کیا فائدہ تھا؟ اور اربوں سال کے ارتقا کے بعد انسان کا

وجود میں آنا، ایک کار بے معنی تھا۔ بے معنویت کے تصور ہی سے میرے حلق میں پھندے لگ جاتے ہیں اور سانس رکنے لگتا ہے۔

کالم نویس 'بھیدی' لکھتا ہے:

''مجروح سلطان پوری ترقی پسند شاعر ہیں لیکن وہ اپنی ترقی پسندی کی قیمت اپنی روحانی قدروں کی صورت میں ادا کرنے کے قائل نہیں۔ انہوں نے عصمت چغتائی کی تعزیت کے لیے ان کے گھر جانے یا تعزیتی بیان جاری کرنے سے انکار کر دیا۔

دوسری طرف عصمت چغتائی کے ایک عزیز کا بیان ہے کہ عصمت چغتائی نے اگر اس نوع کی کوئی وصیت کی تھی تو اس پر عمل درآمد کا کوئی جواز نہیں تھا کہ وہ گزشتہ چار برس سے شدید ذہنی انتشار کا شکار تھیں چنانچہ متعدد مرتبہ وہ ''ناگفتہ بہ حالت'' میں کھڑکی کے پاس جا کر کھڑی ہو گئیں اور خودکشی کی نیت سے کودنے کا ارادہ کیا۔''

تو عصمت چغتائی بھی بے معنویت کا شکار تھیں۔ انہوں نے غرق دریا ہونے کی بجائے نذر آتش ہونا قبول کیا۔ جب تخلیق کے سوتے خشک ہو جاتے ہیں تو اکثر ادیب ایسی ہی جذباتی اور ذہنی حالت میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ آرتھر کوئسلر نے خودکشی کی اور ارنسٹ ہیمنگوے کے متعلق بھی یہی گمان ہے۔

ہندوستان کے اکثر مسلمان دانشور احساس کمتری کا شکار ہیں۔ وہ زندگی میں بھی اور مرنے کے بعد بھی ''سیکولر'' ہونے کا ثبوت مہیا کرتے رہتے ہیں۔ چھا گلہ اور دلوائی۔

اللہ کا شکر ہے کہ چند سال قبل خواجہ احمد عباس نے داعی اجل کو لبیک کہا تو انہوں نے اپنی وصیت میں دفن ہونے کو ترجیح دی ورنہ ان سے بڑا سیکولر کون تھا۔ وہ

ایک نہایت مخلص مسلم گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے والد خواجہ غلام الحسنین پانی پتی دین اسلام پر عمل کرتے تھے اور انہوں نے ایک رسالہ ''تنقید لطیف بر خیالات ظریف'' لکھا جس میں ایک دہرئے پروفیسر کے وجود باری تعالےٰ پر اعتراضات کا مدلّل جواب ہے۔

اسی کالم میں سید بشارت شکوہ کا ایک مضمون درج ہے جو انہوں نے خواجہ احمد عباس کی وفات کے متعلق لکھا ہے۔ ان کے مطابق ان کا جنازہ اٹھنے سے پہلے جو وصیت سنائی گئی، وہ چار شقوں پر مبنی ہے:

1. ان کی لاش کو بلٹز اخبار کے آخری صفحات سے لپیٹا جائے، اس لیے کہ وہ یہ صفحہ مسلسل پچاس سالوں سے لکھتے آئے تھے۔
2. ان کی میت کے آگے آگے ''مراٹھی'' ساز ''لیزم'' بج رہا ہو۔
3. ان کی لاش کو جوہو بیچ پر لے جایا جائے جہاں مہاتما گاندھی کا مجسمہ نصف ہے۔ ان کی لاش کو مجسمے کے سامنے کچھ دیر رکھنے کے بعد اس قبرستان میں لے جا کر دفن کیا جائے جہاں ان کی مرحومہ بیوی دفن ہیں۔
4. جب ان کی موت پر تعزیتی جلسہ ہو تو ہر مذہب و ملت کے لوگ تقریریں کریں۔

جناب بشارت شکوہ کے مشورے پر طے ہوا کہ ''لیزم'' نہ بجایا جائے۔ اس طرح خواجہ صاحب کو سیکولرزم کا سرٹیفکیٹ تو ضرور مل جاتا لیکن اس صورت میں وہ اللہ اور رسول ﷺ کے سرٹیفکیٹ سے ضرور محروم ہو جاتے۔ البتہ ان کی میت کو بلٹز کے پرچوں سے لپیٹا گیا حالانکہ ان پرچوں پر فلمی تصویریں تھیں اور اسے مہاتما گاندھی کے مجسمے کے سامنے بھی رکھا گیا۔ چونکہ وہ قبرستان بہت دور تھا جہاں خواجہ صاحب مرحوم کی اہلیہ دفن تھیں۔ اس لیے قریب ترین قبرستان میں دفن کیا گیا۔

جناب سید بشارت شکوہ کے مضمون کا آخری پیرا درج ذیل ہے۔

''مہاتما گاندھی کے (مجسمے کے) سامنے لاش رکھ کر سیکولرزم کا مظاہرہ بھی ہوگیا اور نیشنلسٹ ہونے کی سند بھی مل گئی۔ بے چارے خواجہ صاحب کی اس خواہش کا احترام نہ کیا گیا جس کے مطابق انہیں اس قبرستان میں دفن کیا جاتا جہاں ان کی محبوب شریک حیات دفن تھیں۔ صرف اس لیے کہ وہ بہت دور تھا جس کے سبب شرکائے جنازہ کو زحمت ہوتی۔ اس معاملے میں کسی کو احترام وصیت کا خیال نہ آیا۔

میں خواجہ صاحب سے واقف تھا۔ اس لیے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ خواجہ صاحب کو پیسے کا لالچ نہ تھا اور اقتدار کی ہوس نہ تھی مگر تھا اور بہت تھا تو شہرت کا لالچ۔ وہ زندگی میں شہرت چاہتے تھے اور مرنے کے بعد (بھی) شہرت چاہتے (تھے)۔

یہ کمزوری متعدد باعنان اسلام کی ہے۔''

خوشی کا ایک لمحہ

بزرگوں نے سکھایا تھا کہ رات کو سونے سے پہلے کلمہ ضرور پڑھنا چاہیے اور اللہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کرنا چاہیے۔ اس پر عمل کچھ آٹومیٹک سا ہوگیا ہے۔ جوانی میں چند روز الحاد تو نہیں 'شک' میں گزرے، ان دنوں بھی یہ عمل جاری رہا۔ 'اللہ ہو' کا ذکر دل کو تسکین بخشتا ہے۔ ایک زمانہ ایسا آیا جب دل ذاکر ہوگیا۔ مجھے بھی اچانک اس کا احساس ہوا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ ایک بار میں نے اپنے دل پر 'اللہ' کا لفظ لکھا ہوا دیکھا۔ لکھا ہوا نہیں ابھرا ہوا۔ صرف یہی لفظ روشن تھا۔ دل کا باقی حصہ سیاہ تھا۔ یہ کیفیت پھر کبھی لوٹ کر نہیں آئی۔

پچھلے دنوں میں کرانک بران کائیٹکس (دمے) کے حملے کی شدت میں 'اللہ ہو'

کا ورد کرتا رہا بلکہ اپنے آپ ہوتا رہا۔ ہفتے عشرے سے طبیعت نارمل ہے۔ پرسوں شب جب رضائی میں منہ دے کر مراقبہ کیا، پہلے کلمہ پڑھا، پھر توبہ استغفار کی، تب اللہ ہو، کا ورد شروع ہوگیا، تو ایک ''اللہ ہو، کے بعد'' یوسف کھوہ کی آواز سنائی دی اور تب اچانک اور شدید 'خوشی' کا ایک لمحہ آیا کہ میں بے اختیار رو پڑا۔ 'خوشی' کا فلیش نہایت آنی و فانی گزر گیا تو عام ذہنی حالت لوٹ آئی۔ وہی منطقی اور عقلی حالت جس میں شک بھی ہوتا ہے اور 'یقین' بھی۔ کبھی شک کا پلڑا جھک جاتا ہے اور کبھی یقین کا۔ شک کا پلڑا جھکے تو یقین بہت ہی سبکسار، محسوس ہوتا ہے اور یوں لگتا ہے کہ اعتقاد و اعمال کی عمارت کی بنیاد ہل رہی ہے اور جو نقش بھی تھا، وہ ریت پر بنا تھا اور مٹ گیا ہے۔

بہر حال خوشی کا یہ لمحہ حقیقی تھا۔ جب میں سکول سے واپس آیا کرتا تھا۔ گرمیوں کی سخت گرم دوپہر کو کبھی کبھار ایک کیکری کے چھدرے سائے تلے بیٹھ جایا کرتا تھا۔ اس میں چھپی کوئی فاختہ کُوکُو کرتی تو طبیعت میں اداسی کا سایہ بھی گہرا ہوتا اور سائے میں خوشی کا ایک' جگنو' بھی چمک اٹھتا۔ کیا پتہ کہ فاختہ اللہ ہو، کا ورد کرتی ہو اور جو کہ بزرگ کہتے تھے، وہ کہتی ہے ''اللہ ہو یوسف کھوہ'' یعنی ہائے یوسف، کو کنویں میں پھینک دیا، ظالموں نے۔

ممکن ہے کہ ''یوسف کھوہ'' کے قافیے کے یاد آنے سے ماضی کے کسی لمحے کی بازیابی ہوگئی ہو۔ باقی رہے آنسو وہ خوشی کے بھی ہو سکتے ہیں اور بڑھاپے کے بھی (Senile Tears) اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

پہلا انعام

8 جون 1992ء

آج میمونہ زینب عرف مونا کو پہلا انعام ملا ہے۔

کل ہی معلوم ہوگیا تھا کہ وہ نرسری (بی) میں سیکنڈ آئی ہے۔ ہر مضمون میں

اس کے پورے نمبر تھے۔ صرف اردو میں ایک نمبر کم آیا اور اسی وجہ سے وہ دوم قرار دی گئی۔ مونا بہت خوش تھی کہ کل یعنی آٹھ جون 1992ء کو اسے مارننگ اسمبلی میں انعام ملے گا۔ اس کی سب سے بڑی بہن عقیلہ زینب کی کلاس میں بارھویں پوزیشن آئی ہے۔ اس سے چھوٹی فضیلہ زینب کی چھٹی پوزیشن آئی ہے۔

یہ تینوں میرے تیسرے نمبر کے بیٹے سید نصیر عباس نقوی انجینئر نیس پاک(NESPAK) کی بیٹیاں ہیں۔ ان دنوں میں اس کے مکان میں رہائش پذیر ہوں۔ یہ مکان پنجاب گورنمنٹ ایمپلائیز ہاؤسنگ سوسائٹی (نزد ٹاؤن شپ لاہور) میں واقع ہے۔

بچوں کے سکول جانے کے بعد گھر میں میں اور عزیزہ عترت (جو میری بھتیجی بھی ہیں اور بہو بھی) اکیلے رہ جاتے ہیں۔ تقریباً ایک بجے دوپہر بچیاں سکول سے واپس آئیں۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی مونا نے رنگین کاغذ میں لپٹا ایک چھوٹا سا پیکٹ مجھے دکھایا۔ دادا! یہ میرا انعام ہے۔ پرنسپل سے میں نے ہاتھ بھی ملایا تھا۔''

پیکٹ میں رنگدار پنسلیں تھیں۔

مونا انعام کے ملنے پر بہت خوش ہے۔ میں اس سے تقریباً چھیاسٹھ سال کے فاصلے پر اس ''خوشی'' کے کم و کیف کا اندازہ نہیں لگا سکتا۔ میرا احساس کند ہو چکا ہے اور حادثات زمانہ نے ''جلد'' اتنی موٹی کر دی ہے کہ نسیم سحر کا ہلکا سانس اسے بیدار بھی نہیں کرتا اور یہ ننھی سی خوشی نسیم سحر کا ہلکا سا سانس ہی تو ہے!

پچھلے جمعے جب میں 'بدر بلاک' گیا تو قنبر عباس نے مجھے وہ کپ دکھایا جو اسے سیکنڈ آنے پر انعام میں ملا تھا۔ یہ انعام اسے وزیراعظم پاکستان کے چھوٹے بھائی میاں شہباز کے ہاتھوں ملا تھا۔ قنبر عباس میرا چاہیتا پوتا ہے۔ وہ اپنی طرز کا واحد آدمی ہے۔ یہی کیفیت مونا کے کردار میں بھی مجھے نظر آتی ہے۔

اسی شام صوفے کے پیچھے کھڑے ہو کر مونا نے میری ''ٹنڈ'' کو چھو کر کہا ''تند

والے بے بی!'' تو میں دیر تک حیران رہا۔ کیا ایک ستر سال کا بوڑھا ایک چار سالہ بچی کو اپنے مقابلے میں ''بے بی'' نظر آتا ہے؟ یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ اسے کسی ''تند والے بی بی'' کی خواہش ہو۔ ایک ننھے سے گول مٹول سے بھیا کی............

نیکی کی تلاش

12 اگست 1992ء

ان دنوں حسینہ معین کا ایک سیریل پاکستان ٹیلی ویژن پر چل رہا ہے۔ اس کا عنوان ''کسک'' ہے۔ پرسوں آٹھ بجے رات اس سیریل کی غالباً چوتھی قسط دیکھی آج کل سیریل کی ہر قسط کا انجام سسپنس پر ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ انجام فطری اور برجستہ (Spontaneous) تو نہیں ہوتا البتہ دیکھنے والے کے دل میں ایک اشتیاق ضرور پیدا کرتا ہے کہ دیکھیے اگلی قسط میں کیا ہوتا ہے۔ ''کسک'' کی اس قسط کا انجام اتنا مکمل محسوس ہوا کہ اگر حسینہ معین چاہتیں تو ڈرامے کا یہی انجام مناسب رہتا۔

حسینہ معین جذباتی انداز کی ڈرامائی کیفیت پیدا کرنے میں کمال رکھتی ہیں۔ یہ انجام اتنا جذباتی تھا کے بے اختیار میرا جی بھر آیا۔ میں نے بیٹے، بہو اور پوتیوں کی موجودگی میں آنسو بہانا مناسب نہ سمجھا۔ میں باہر 'گلی' میں جا کر ٹہلنے لگا اور روتا رہا۔ ''گلی'' سے مراد کاریڈور ہے۔ جب چہرہ آنسوؤں سے بھیگ گیا تو میرا بھی کتھارسس ہوگیا۔

اس منظر میں انسان کے اندر چھپی ہوئی ''نیکی'' بروئے کار لائی گئی ہے۔ ممکن ہے، میری رقت کی یہی وجہ ہو۔ اصل میں زمانے کا دستور یہ ہے کہ 'بدی' کو بہت نمایاں کیا جاتا ہے۔ آج کے زمانے میں 'بدی' کی نمود و نمائش کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی ہے۔ سینما میں، ٹیلی ویژن پر، اخبارات اور رسالوں میں جہاں ''بدی'' کی مذمت مقصود ہوتی ہے، وہاں عجیب بات ہے کہ اس کا ایجابی پہلو زیادہ نمایاں ہوتا ہے۔ ایک معصوم ذہن پر یہ

اثر مرتسم ہوتا ہے کہ بدی بہت طاقتور ہے، اس میں گلمیر ہے، اسی سے زندگی میں حرکت اور روانی آتی ہے، اس کے مقابل میں ''نیکی'' کو بہت عاجز، بے رنگ اور خاک بسر دکھایا جاتا ہے۔ یہ ''نیکی'' کا منفی روپ ہے۔ اس میں وہ قوت اور حرکت نہیں جو آدمی کو اپنے غلبہ وتسلط کے سیلاب میں بہا لے جائے۔ ''نیکی'' ہمیشہ ایک ''مظلوم'' کی صورت میں جلوہ پذیر ہوتی اور 'بدی' ایک ایسے ظالم کی صورت میں کہ جس کے دس ہاتھ ہیں اور ہر ہاتھ میں کوئی ہتھیار ہے۔ جب 'نیکی' کو 'بدی' پر غالب دکھایا جاتا ہے تو اس وقت ''نیکی'' بھی ''بدی'' کے ہتھیاروں سے لیس ہوکر اس کا مقابلہ کرتی ہے۔

نیکی کی تلاش میں بہت مشکلیں پیش آتی ہیں اور نیکی کا ساتھ دینا تو پیغمبروںؑ کی سنت پر عمل کرنا ہے۔ اس کا بول بالا کرنا تو ہتھیلی پر سر رکھنے کے مترادف ہے۔ منفعل قسم کی ''نیکی'' سے بدی بہتر ہے۔ غالب کا ایک مصرع ہے۔

جہاں تلوار کو دیکھا جھکا دیتا ہوں گردن کو

اس انفعالی عمل میں قربانی اور ایثار کی ''نیکی'' تو ضرور ہے لیکن ''نیکی'' کا وہ روپ نہیں جو تلوار کو تلوار کے مقابل ہونے پر ابھارتا ہے۔

نرم روٹی

29 اگست 1992ء

امیر المومنین علی علیہ السلام کا بھُنی ہوئی کلیجی کو نرم روٹی کے ساتھ کھانے کو جی چاہا اور اس خواہش کو ایک سال کا عرصہ گزر گیا۔ ایک دن امام حسین علیہ السلام سے اس خواہش کی تکمیل کا اظہار فرمایا اور اس دن حضرت امیرؑ روزے سے تھے۔ جب مذکورہ کھانا افطار کے وقت تیار ہوگیا تو سائل نے آکر دروازے پر دستک دی۔ امیر المومنین نے حکم دیا کہ یہ کھانا سائل کو دے دیا جائے مبادا کل بروز قیامت جب ہمارا نامہ اعمال پڑھا جائے تو ہم سے کہیں ''اَذۡهَبۡتُمۡ طَيِّبٰتِكُمۡ فِىۡ حَيَاتِكُمُ الدُّنۡيَا وَاسۡتَمۡتَعۡتُمۡ بِهَا''

(تم تو اپنی طیبات سے دنیا میں بہرہ ور ہو چکے ہو اور ان سے لذت اٹھا چکے ہو) تفسیر نمونہ اکیسویں جلد ص 312 ترجمہ صفدر حسینؒ)

دُخان (دھویں) سے دُخان (دھویں) تک

29 اگست 1992ء

1. پھر آسمان کی طرف متوجہ ہوا اور وہ (اس وقت) دھواں (سا) تھا تو اس نے اس سے اور زمین سے فرمایا کہ تم دونوں آؤ خوشی سے خواہ کراہت سے۔ دونوں نے عرض کی ''ہم خوش خوش حاضر ہیں۔'' سورہ حٰم سجدہ، آیت 11)

2. تم اس دن کا انتظار کرو کہ آسمان سے ظاہر بظاہر دھواں نکلے گا اور لوگوں کو ڈھانک لے گا اور یہ دردناک عذاب ہے۔ (سورہ دخان آیات 10 اور 11) (ترجمہ از مولانا فرمان علی مرحوم)

24 جنوری 1994 کو میری والدہ محترمہ 90 سال کی عمر میں وفات پا گئیں۔ جب مجھے میرے بیٹے نصیر عباس نے ان کی وفات کی خبر سنائی تو میں بے اختیار رونے لگا۔ میری عمر کے ساٹھ سال اچانک میری زندگی سے خارج ہو گئے اور میں گیارہ سال کا بچہ بن گیا کہ جو یکا یک ماں کے سائے سے محروم ہو گیا ہو۔ تاہم جب آنسوؤں نے غم کا غبار دھو دیا اور دل و دماغ آئینے کی طرح صاف ہو گئے، تب مجھے ایک خاص طرح کا اطمینان نصیب ہوا۔ طوالت عمری بذاتہ ایک عذاب ہے اور اس پر معذوری۔ گزشتہ کئی سالوں سے ان کی دیکھ بھال ہم بھائیوں کے لیے ''دست تہہ سنگ'' والی کیفیت کی حامل تھی۔ الحمد للہ کہ ہم ان کی طرف سے سرخرو ہوئے۔ اکہتر سال خود بہت بڑا بوجھ ہیں۔ یہ بوجھ کسی مزید بار گراں کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ اب میں ہلکا پھلکا ہو گیا ہوں اور اپنے نحیف و نزار جسم کے ساتھ دمے کے عذاب سے نباہ کرنے میں کچھ آسانی ہو جائے گی۔

میری والدہ مرحومہ نے آخری ایک سال جس معذوری میں بسر کر دیا تھا، وہ یہ تھی کہ ان کے بائیں کولھے کی ہڈی (فیمر بون) ٹوٹ گئی تھی اور ڈاکٹروں نے آپریشن کر کے دھات کا پرزہ ڈالنے سے معذرت کر دی تھی۔

انہیں دنوں میری بیوی جو مجھ سے صرف ایک سال چھوٹی ہے، شوگر لیول کے بڑھ جانے سے بہت زیادہ ذہنی اشتعال کی کیفیت میں مبتلا تھی۔ اسے ذہنی امراض کے ماہر ڈاکٹر رشید کو دکھایا گیا۔ اس کی دوائی سے ان کا غصہ تو بہت کم ہو گیا لیکن دن رات ایک نشے کی سی کیفیت اس پر طاری رہنے لگی۔

میری بیوی بیچاری بہت مظلوم ہے۔ 'مظلوم' اس لحاظ سے کہ گزشتہ تیس سال سے وہ مختلف بیماریوں کی آماجگاہ بنی ہوئی ہے۔ تقریباً چالیس سال کی عمر تک وہ خاصی صحت مند تھی۔ چار بیٹوں اور ایک بیٹی کا بوجھ وہ بڑی خوش اسلوبی سے برداشت کر رہی تھی۔ گھر کا کون سا کام تھا جو وہ نہیں کرتی تھی۔ میں نے اسے صبح سے شام تک گرہستی کی چکی چلاتے ہوئے دیکھا۔ زبان کی وہ تیز ضرور ہے لیکن اس کا دل کینے سے خالی ہے۔

1964ء کے موسم بہار میں اچانک اس کی پشت پر ایک پھوڑا سا نکلا۔ معلوم ہوا کہ یہ ذیابیطس کی وجہ سے ہے جس سے ہم سب بے خبر تھے۔ آپریشن سے پھوڑا ٹھیک ہو گیا۔ کچھ عرصہ بعد جو بچہ پیدا ہوا، وہ ایک سانس بھی اس دنیا میں نہ لے سکا۔ اس کی پیدائش بیچاری ماں کے لیے زندگی اور موت کی کشمکش کا آغاز تھی۔ اس کے بعد اس کا وجود طرح طرح کی بیماریوں کی آماجگاہ بن گیا۔

ایک جملہ معترضہ!

اس بچے کو میں دیکھ بھی نہ سکا۔ میں ان دنوں بہاول نگر میں تھا۔ میرے برادرِ خورد جواد حیدر مرحوم نے اسے اپنے ہاتھوں سے قبر میں رکھا۔ وہ خود بہت رویا اور جب اس نے اس نہایت صحت مند اور خوبصورت بچے کی شکل وصورت کا نقشہ میرے سامنے

کھینچا، تو ایک فقرہ کہا ''بھائی جی! اسے مردہ تسلیم کرنے کو جی نہیں مانتا تھا۔'' میں بھی رویا اور پھر نہ جانے کیا ہوا کہ جب کبھی مجھے یک سوئی حاصل ہوتی، اس نادیدہ بچے کا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے آجاتا۔ پتہ نہیں کیوں، اس کا موت کا ذمہ دار میں اپنے آپ کو سمجھتا۔ کئی بار خواب میں میں نے دیکھا کہ میں نے کسی کو قتل کر دیا ہے اور انجام قتل سے لرزہ براندام ہوں۔ اتنا خوف مجھ پر طاری ہوتا کہ میرا جسم پسینے میں نہا جاتا۔ تب میں نے ایک افسانہ ''الصّبی'' کے عنوان سے لکھا اور اس کیفیت سے مجھے نجات حاصل ہوئی۔ میں نے گویا اسے زندہ کر دیا تھا۔

ستمبر 1965ء سے میری بیوی لاہور میں مقیم ہے۔ اس اثنا میں اسے معدے میں ریح کا عارضہ ہوا۔ ذیابیطس تو نہایت مخلص ساتھی ہے کہ ساتھ نہیں چھوڑتا۔ 'ہوا' جب دل کو چڑھتی تو اس کا حال بُرا ہو جاتا۔ شاید ہی لاہور کا کوئی حکیم یا ڈاکٹر (ایلوپیتھک اور ہومیوپیتھک) ہوگا جس کے مطب میں ہم نہ پہنچے ہوں۔ اس عارضے پر مستزاد تین میجر اپریشن۔ (۱) رحم کا (۲) پتے کا اور (۳) دائیں کولھے کی فیمر بون کے ٹوٹنے کا کہ جسے دھات کے پرزے میں جکڑا گیا لیکن وہ چل پھر لیتی تھیں۔ 'ریح' کے ساتھ ساتھ 'شوگر' میں اضافہ ہوتا چلا گیا اور ان کے مزاج میں اتنا اشتعال پیدا ہوا کہ خدمت گزار بیٹے اور بہوئیں بھی تنگ آگئیں۔ وہ خود 'اپنے ماحول' سے اتنا بیزار ہوتی کہ کبھی بیٹی کے پاس راولپنڈی چلی جاتی اور کبھی گاؤں میں اپنے بھائی کے پاس لیکن کہیں اسے چین نہ ملتا۔ باتیں بھی اکثر بے سروپا کرتی۔ اسی حال میں وہ بھی ہمارے ساتھ گاؤں (بھڑتھ) چلی گئی جہاں والدہ مرحومہ کو دفن کرنا تھا۔ میں نے اسے روکا بھی لیکن وہ نہ مانی۔ میں بھی اصرار نہ کرسکا۔ گاؤں میں رشتہ داروں کا جھمگٹا تھا۔ 27 جنوری کی صبح کی واپسی تھی۔ اسی دن صبح صبح وہ غسل خانے میں گئی اور اس کا پاؤں پھسل گیا۔ جسم اس کا بھاری ہے۔ بڑی مشکل سے میرے داماد اور بیٹوں بھتیجوں نے اسے غسل خانے سے نکالا اور بستر پر لٹایا۔ سول ہسپتال سیالکوٹ کے ایم ایس ڈاکٹر مختار علی میرے بڑے بیٹے ظہیر الحسن نقوی

کے بڑے مخلص دوست ہیں۔ اسے وہاں لے گئے۔ ایکسرے سے معلوم ہوا کہ بائیں کولھے کی ہڈی (فیمر بون کی گردن) ٹوٹ گئی ہے۔ ایمبولینس پر سروسز ہسپتال پہنچایا گیا۔ یہاں آئی سی یونٹ میں میرا بھتیجا ڈاکٹر حماد رضا کام کرتا ہے۔ اس کے توسط سے انہیں آئی سی یونٹ میں بیڈ مل گئی۔ تین چار دن بعد ہڈیوں کے ایک سرجن ڈاکٹر نصرت علی نے ان کا اپریشن کیا اور پرزہ ڈال دیا۔

اپریشن ٹھیک ٹھاک ہوا تاہم ہسپتال میں پرائیویٹ کمرہ نہ ملنے کی وجہ سے انہیں جلد فارغ کر کے گھر بھیج دیا گیا۔ 174 بدر بلاک میں انہیں رکھا گیا۔ غلطی یہ ہوئی کہ انہیں پیشاب کی نالی نہ لگائی گئی۔ کروٹ بدلوانے کے لیے کوئی گھر میں موجود نہ ہوتا۔ پیشاب بھی بستر پر خطا ہو جاتا۔ زخم بگڑ گیا اور ڈاکٹر نصرت علی گھر آئے۔ ان کا مشورہ تھا کہ انہیں پھر ہسپتال لے جایا جائے۔ ان کے زخم کا دوبارہ اپریشن ہوا اور یہ دیکھ کر ڈاکٹر بہت ناراض ہوا کہ انہیں بیڈ سور ہو چکا تھا اور وہ خاصا بگڑ گیا تھا۔ اس کا اپریشن ہوا تو ایک اور بڑا زخم ہو گیا۔

وہ آئی سی یونٹ میں تقریباً تین ہفتے رہیں۔ چونکہ ذہنی حالت نہایت خراب تھی، اس لیے رات رات بھر بین کرتی رہتیں۔ آئی سی یونٹ کا سٹاف اور نرسیں ان سے تنگ آ گئیں۔ ڈاکٹر حماد رضا اگر وہاں نہ ہوتا تو نہ جانے کیا صورت حال بنتی۔ بہر حال 12 مارچ کو انہیں گھر لانا پڑا۔ اس بار انہیں چھوٹے بیٹے نصیر عباس (انجینئر) کے گھر منتقل کیا کہ یہاں سے ڈاکٹر حماد رضا کا مکان (ٹاؤن شپ میں) صرف ایک میل کے فاصلے پر ہے اور وہ روزانہ پٹی کرنے کے لیے آسانی سے آجا سکتا ہے۔ نصیر عباس کا مکان پنجاب گورنمنٹ ایمپلائیز کالونی میں ہے۔

اچانک ان کی حالت بہت خراب ہو گئی۔ شوگر لیول اتنا بڑھ گیا کہ آلے پر آخری حد سے بھی آگے چلا گیا۔ مجھے تو یقین ہو گیا کہ اب دنوں کی نہیں، گھنٹوں کی بات ہے۔ حماد رضا نے ڈرپ لگائے اور گھنٹے دنوں میں بدل گئے۔ ان کے بھائی، بیٹی اور

دیگر عزیزوں کو اطلاع دے دی گئی۔ سبھی لوگ آ گئے اب اسے معجزہ کہوں یا ایک گنہگار انسان کی آزمائش میں کچھ کمی باقی رہ گئی تھی کہ ان کی حالت سنبھل گئی۔ کم از کم ایک ہفتہ ''کومے'' کی حالت میں رہ کر وہ پھر اس دنیا میں لوٹ آئیں۔ انہیں نالی سے غذا دی جانے لگی۔ شوگر کا لیول اگرچہ نارمل تو نہ ہوا لیکن کم ہوگیا۔ پھر ڈرپ اتار لیے گئے۔ بعدازاں غذا کی نالی بھی اتار دی گئی۔

اب وہ ہوش میں ہیں۔ لیکن کیا واقعی یہ ہوش مندی کی زندگی ہے؟ نہیں وہ بستر پر لیٹی ہیں اور خود کروٹ بھی نہیں بدل سکتیں۔ اپنے ہاتھ سے پانی نہیں پی سکتیں نہ خوراک لے سکتی ہیں۔ کتنی مجبوری ہے! جب بھی ان کے سرہانے جاتا ہوں، وہ التجا کرتی ہیں کہ میری موت کی دعا کیجیے۔ میں ان کی فرمائش کیسے پوری کرسکتا ہوں۔ یوں موت بھی تو قدرت کی ایک نعمت ہے! اور مجبور و بے کس زندگی اس کا عذاب!

میں بہت پریشان ہوں۔ پریشان نہیں، ''بے یقینی'' کے عالم میں ہوں۔ نماز پڑھتا ہوں تو بے یقینی کے ساتھ، دعا کرتا ہوں تو بے یقینی کے ساتھ۔ ایمان بالغیب کی خوبصورت عمارت نہایت نازک بنیادوں پر قائم ہوتی ہے۔ ذرا ہل جائے تو دراڑیں پڑ جاتی ہیں۔ میں خوف کی حالت میں ہوں۔ مجھے 'ایمان' بہت عزیز ہے۔ میرے لیے یہ ایک ایسا 'حجرہ' ہے جہاں اطمینان کا مصلے بچھا ہے اور انسان سربسجود ہے۔ کیا خوب فرمایا ہے مولائے کائنات نے کہ بے یقینی کہ نماز سے یقین کی نیند بہتر ہوتی ہے۔ 'یقین' ہی تو سب کچھ ہے۔

اور آج صبح میں نے نماز بھی دیر سے پڑھی۔ دیر سے جاگا۔ اس لیے نہایت پچھتاوے کی حالت میں تھا۔ رات کی نیند بھی یقین کی حالت میں نہیں گزری تھی۔ نماز کے بعد تلاوت کی۔ میری ایک بہت بڑی کمزوری ہے کہ ایسی ذہنی اور روحانی نقاہت کے عالم میں ''قرآن'' سے استفسار کرتا ہوں۔ میرے والد مرحوم مجھے اس سے بہت منع فرمایا کرتے تھے۔ 'قرآن' سے استخارہ لینے کو بھی وہ اچھا نہیں جانتے تھے کیونکہ اس قوت

فیصلہ کمزور پڑ جاتی ہے حالانکہ استخارہ لینا جائز ہے۔

میں کئی دنوں سے استفسار' کی خواہش کو پس پشت ڈال رہا تھا۔ آج اس خواہش نے مغلوب کر لیا۔ اللہ تعالیٰ سے پہلے استغفار کیا، گستاخی کی معافی مانگی، محمد ﷺ و آل محمد ﷺ کا واسطہ دیا۔ پھر قرآن کھولا اور دائیں طرف کے صفحے کی پہلی سطر پر نظر ڈالی۔ میں ان دنوں پیر ابراہیم ٹرسٹ کی حمائل سے تلاوت کرتا ہوں۔ اس کے صفحہ نمبر 432 کی پہلی سطر کا ترجمہ یوں ہے۔

"(بعد) ایک سال ایسا آئے گا جس میں لوگوں کے لیے خوب مینہ برسے گا اور انگور بھی خوب پھلے گا اور لوگ اس سال انہیں شراب کے لیے نچوریں گے۔" (پارہ 12 سورہ یوسف۔ آیت نمبر 49۔ ترجمہ از حافظ فرمان علی مرحوم)

اس آیت کا پہلا لفظ "ثم" ہے، جو پچھلے صفحے یعنی 431 کا آخری لفظ ہے۔ اس کے معنی "پھر" ہیں۔ ترجمے کے یہ الفاظ نیچے درج ہیں۔ (بس) پھر (اس کے)

یہ ایک نوید ہے۔ سات سالوں کی خشک سالی کے بعد مینہ اور فصلوں کے پھلنے پھولنے کی نوید.........

اب مجھے معلوم نہیں کہ مجبور و بے کس مریضہ کے لیے اس 'نوید' کے کیا معنی ہیں؟ کیا اسے اتنی صحت حاصل ہو جائے گی کہ وہ بستر سے اٹھ کر کم از کم اپنی ذات تک معمولات زندگی کو دوبارہ جاری کر سکے گی۔ یا

اسے زندگی اور موت کی اس کشمکش سے بالآخر رہائی مل جائے گی۔ کیا اس کی آخری منزل آسان ہو جائے گی؟ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

لیکن میں قنوطیت کے جس تاریک حجرے میں آج کل مقید ہوں، اس میں مجھے روشنی کی ایک کرن در آتی ہوئی نظر آ رہی ہے۔ درود و سلام ہو محمد ﷺ اور اس کی آلؑ پر۔

یقین وگماں

10 مئی 1994ء

اوران میں سے اکثر تو بس اپنے گمان پر چلتے ہیں (حالانکہ) گماں یقین کے مقابلے میں ہرگز کچھ بھی کام نہیں آسکتا۔ بے شک وہ لوگ جو کچھ (بھی) کر رہے ہیں، خدا اسے بہتر جانتا ہے۔

(سورہ یونسؑ آیت نمبر 36۔ ترجمہ از مولانا حافظ فرمان علی مرحوم)

مولائے کائنات حضرت علی علیہ السلام نے ایک خارجی کے متعلق سنا کہ وہ نماز شب پڑھتا ہے اور قرآن کی تلاوت کرتا ہے تو آپ نے فرمایا:

''یقین کی حالت میں سونا شک کی حالت میں نماز پڑھنے سے بہتر ہے۔

(نکتہ 97، ص 832، نہج البلاغہ، مترجم مفتی جعفر حسین)

سن اے تہذیب حاضر کے گرفتار
غلامی سے بَتَر ہے بے یقینی

(بتر = بدتر۔ علامہ اقبال)

قرآن میں بے یقینی کے لیے 'ظن' کا لفظ آیا ہے۔ مترجم نے اس کا ترجمہ 'گمان' کیا ہے۔

میری روزانہ کی دعائے صبح یہ ہے۔

یا ارحم الراحمین! میرے دل سے اوہام وشکوک دور کر اور مجھے ''حق الیقین'' کی منزل پر پہنچا!

صبح کی نماز میں کبھی کبھار یہ محسوس ہے کہ منزل کی طرف ایک انچ بڑھا ہوں۔ عشا کی نماز تک اوہام وشکوک اتنا غلبہ پالیتے ہیں کہ دو گز پیچھے ہٹا ہوا ہوتا ہوں۔ ابھی تک کوئی رات ایسی نہیں آئی کہ یقین کی حالت میں سونا نصیب ہو۔

''هَنِیءً'' یاHoney

كُلُوا وَاشْرَبُوا هَنِيْئًا بِمَا كُنتُم تَعمَلُونَ ○

(سورۂ مرسلات۔43۔ پارہ29)

ترجمہ:

کھاؤ اور مزے مزے سے پیو، یہ ان اعمال کے مقابلے میں ہے جنہیں تم انجام دیتے تھے۔ (تفسیر نمونہ)

تفسیر:

''هَنِیءً'' (بروزن ملیح) ''مفردات'' میں ''راغب'' کے قول کے مطابق ہر وہ چیز ہے جس کے لیے مشقت نہ کرنی پڑے اور اس سے کوئی تکلیف اور پریشانی پیدا نہ ہو۔ اس لیے خوش مزہ غذا اور پانی کو 'ھنیٔ' کہا جاتا ہے اور بعض اوقات خوشگوار زندگی پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ (تفسیر نمونہ)

............: انگریزی میں شہد کو 'ہنی'(Honey) کہا جاتا ہے۔ عربی اور انگریزی کے الفاظ میں مماثلت حیرت ناک ہے۔ شہد کے خوش مزہ ہونے میں کیا شک ہوسکتا ہے۔ بہرحال یہ مماثلت دوراز کار ضرور معلوم ہوتی ہے کیونکہ عربی میں شہد کو ''عسل'' کہتے ہیں۔ (راقم سطور ہذا)

زمین تمہاری ماں ہے

ایک حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

''وضو اور اپنے اعمال میں سے بہترین عمل 'نماز' کی حفاظت کرو اور زمین کی طرف دیکھتے رہو، کیونکہ وہ تمہاری ماں ہے۔ کوئی بھی انسان کوئی اچھا یا بُرا کام انجام نہیں دیتا مگر یہ کہ زمین اس کی خبر

دیتی ہے۔''

(تفسیر نمونہ جلد 27۔ص 206۔سورۃ الزلزال کی چوتھی آیت کی تفسیر)

يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا

اس روز وہ اپنے سب حالات بیان کردے گی۔

نکتہ:

ہم آج کے انسان زمین پر جو ظلم وستم کررہے ہیں، انہیں اس آیت سے تنبیہ ہونی چاہیے۔ وہ آدمی جس نے زمین سے ایک پودا بھی بلا ضرورت اکھاڑا یا اس کے میدانوں کی جنگلات سے محروم کیا، اسے قیامت کے روز اس کا جواب دہ ہونا پڑے گا۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

31 مئی 1994ء بمطابق 19 ذی الحجہ 1414ھ بروز منگلوار کو شام سات بجے اس قیدی کو رہائی مل گئی جو ایک عرصے سے قفس میں بند تھا یعنی میری رفیقہ حیات غلام زہرا بنت مسکین حسین شاہ کی روح اس بدن کو چھوڑ گئی جو ایک عرصے سے مختلف بیماریوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ اس جسم نے بہت اذیتیں برداشت کیں۔ اذیتیں بھی اور ذلتیں بھی۔ اس جسم کو ذیابیطس نے کھوکھلا کردیا تھا۔ اس درخت کے تنے کی طرح جسے دیمک اندر سے چاٹ جاتی ہے اور صرف خول باقی رہ جاتا ہے۔ یہ خول بھی سلامت نہیں رہا تھا۔ جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں، اس پر بہت سے زخم تھے۔ ایک زخم تو اپریشن کا تھا۔ دوسرے ''بیڈ سور'' تھے۔ ان میں سے کوئی بھی مندمل نہیں ہو رہا تھا۔ ایک دو ہفتے انہیں ڈرپیں لگی رہیں اور ناک کے راستے خوراک دی جاتی رہی۔ اس کے بعد ان کے نہایت ''کمزور'' معدے کو ایک نہایت شدید قوت کی اینٹی بائی آٹک گولی دی جاتی رہی۔ نہ جانے انہیں یہ گولی کس قیامت کے اضطراب میں مبتلا کرتی ہوگی۔

27 جنوری سے 31 مئی تک 124 دن بنتے ہیں۔ انہیں ثانیوں میں

بدلیے۔ ایک ایک ثانیہ مریضہ کے لیے ایک قیامت سے کم نہیں تھا۔ ہزاروں قیامتوں میں سے گزر کر ''قیامت'' تک پہنچنے کا سفر کتنا کٹھن اور دشوار گزار ہے۔

انسان کی زندگی بھی کیا ہے؟

اگر ایک طرف وہ احسن التقویم کا آسمان ہے تو دوسری طرف ''اسفل السافلین'' کا تحت الثرے بھی ہے۔ وہ ''مختال فخور'' بھی ہے۔ ''ظلوم'' جھول بھی ہے۔ سب سے گرانبار ''امانت'' کا اٹھا لینے والا بھی ہے۔ زمین و آسمان اسی کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔ بے شمار نعمتیں اسے حاصل ہیں۔ وہ شکر گزار بھی ہے اور ناشکرا بھی۔ اطاعت گزار بھی ہے اور جھگڑالو بھی۔

لیکن اللہ کی ساری مخلوق میں سے وہ مظلوم ترین مخلوق بھی ہے۔

کبھی کبھار تو اس کی بے بسی اور بے کسی 'گدھے' سے بھی زیادہ بڑھ جاتی ہے جو چوپایوں میں سب سے زیادہ ذلیل جانا جاتا ہے۔

31 مئی کو رات بارہ بجے کے بعد عزیزان سکینہ و تطہیر نے حج سے واپس آنا تھا۔ ان کے استقبال کے لیے سرگودھے سے برادرم سجاد حسین نقوی، عزیزان قارب، راشد، مبین، نابغہ اور مرتاض آئے ہوئے تھے۔ ہپوگڑھے سے سید شفقت حسین نقوی (بہنوئی) اور عزیزہ نصرت (بہن) بھی آئے ہوئے تھے۔ یہ محض اتفاق تھا۔ اس دن صبح ہی سے مجھے مریضہ کی حالت خراب نظر آ رہی تھی۔ تین دن سے وہ ''کومے'' کی حالت میں تھیں۔ اپنے خدمت گزاروں میں بیٹی عفت اور اپنی بہو عترت کو بھی نہیں پہچانتی تھیں بلکہ میرا خیال ہے کہ پچھلے چوبیس گھنٹوں سے انہوں نے آنکھ بھی نہیں کھولی تھی۔ پچھلی شام ڈاکٹر حماد رضا انہیں دیکھنے کو نہیں آیا تھا۔ پٹی غالباً مدثر رضا نے کی تھی لیکن میں ناراض تھا کہ ''ڈاکٹر'' کیوں نہیں آیا۔ ''ڈاکٹر'' میرا بھتیجا ہے اور مجھے بیٹوں کی طرح عزیز ہے۔ اس کی اس غفلت پر میں نے اسے 31 مئی کی صبح کو سرزنش کی۔ مریضہ کا حال بتایا تو وہ فوراً آ گیا۔ تین دن سے مریضہ نے کچھ نہیں کھایا تھا حتیٰ کہ پانی بھی نہیں

پیا تھا۔ میں نے مشورہ دیا کہ ناک میں نالی لگا دی جائے۔ نالی موجود تھی لیکن باوجود تلاش کے نہ مل سکی۔ نصیر عباس نقوی کو فون کیا کہ وہ دفتر سے واپسی پر 'نالی' خرید لائے۔ اس دن حماد رضا نے اپنے ہسپتال سے چھٹی لی لے۔ میں نے بدر بلاک میں سب سے بڑے بیٹے ظہیر الحسن نقوی کو فون کیا کہ وہ فوراً آجائے اور ستلج بلاک میں اپنے سے چھوٹے بھائی صغیر الحسن نقوی کو بھی اطلاع دے دے۔ اس سے یہ بھی کہا کہ شفقت اور سجاد سے کہے کہ وہ بھی آجائیں۔ وہ بدر بلاک میں تھے۔

شفقت میرا ماموں زاد بھائی ہے۔ میری بیوی کا سگا چھوٹا بھائی ہے جیسا کہ میں اوپر لکھ چکا ہوں، میرا بہنوئی بھی ہے۔

شام کے تقریباً سات بجے ڈاکٹر حماد رضا مریضہ کو ناک کے راستے خوراک اور پانی دینے کے لیے 'نالی' درست کر رہا تھا۔ میں نے سجاد سے کہا کہ مجھے 'ٹینشن' بہت ہے اگر میرا ساتھ دو تو باہر سڑک پر ٹہل آئیں۔ اس نے کہا۔ ''بھائی جی! ذرا ایک منٹ بہن جی کو دیکھ لیں۔''

ہم دونوں ان کے کمرے میں داخل ہوئے (دونوں کمروں کے درمیان صرف ایک دیوار حائل ہے) کمرے میں اندھیرا تھا۔ میں نے بجلی جلا دی۔ ادھر کے پلنگ پر ظہیر لیٹے لیٹے سو گیا تھا۔ پندرہ بیس منٹ پہلے عفت اور عترت نے مریضہ کو کروٹ بدلوائی تھی۔ ان کا منہ دیوار کی طرف تھا۔ سجاد نے آگے بڑھ کر انہیں دیکھا تو بے اختیار چلا اٹھا ''بھائی جی! بہن جی تو باقی نہیں رہیں۔'' ڈاکٹر حماد دوڑ کر آیا۔ کروٹ بدلی پپو نے الٹے۔ دل پر سٹیتھوسکوپ لگایا۔ میں نے جسم کو ہاتھ لگایا۔ وہ گرم تھا اور ان کے پاؤں کے تلووں پر مجھے پسینے کی نمی کا احساس بھی ہوا۔ عورتیں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ ظہیر اور نصیر، حماد اور شفقت سبھی روئے لیکن میں نہ رو سکا حالانکہ جب میں نے اپنی ماں کے انتقال کی خبر سنی تھی تو بچوں کی طرح بلک بلک کر رویا تھا۔ میں رو نہ سکا اور میرا سینہ جو پہلے ہی ضیق النفس کا شکار ہے۔ جیسے پتھر بن گیا۔ سانس گھٹ گیا۔ میں

نے ان ہیلر کے دو کش لیے اور میرا سانس بحال ہوا۔ بیٹے اور بھتیجے فون کی طرف متوجہ ہوئے تو میں غسل خانے میں چلا گیا۔ وضو کیا اور نماز پڑھنے کے لیے اوپر کے کمرے میں جانا چاہتا تھا کہ پڑوسی آنا شروع ہوگئے اور مجھے ڈرائنگ روم میں اُن کے پاس جا کر بیٹھنا پڑا۔ نماز رہ گئی۔ یوں بھی مجھے یاد آ گیا کہ میں نے 'میت' کو مس کیا ہوا ہے۔ اس لیے غسل اور پاک کپڑے مجھ پر واجب ہو گئے ہیں۔ اس دن مغربین قضا ہوگئیں کیونکہ جب مجھے ''غسل مسِ میت'' کا موقع ملا، آدھی رات سے اوپر وقت ہو چکا تھا۔ نمازیں تو اکثر قضا ہوتی رہتی ہیں، لیکن مرحومہ کے لیے جو چند آنسو بہانے تھے، وہ بھی قضا ہو گئے۔

آج 25 دن بعد یہ سطور لکھتے وقت میں رویا۔ یوں گزشتہ دنوں میں کئی بار میں نے ان کی جدائی محسوس کی۔ آنسو بھی بہے لیکن رونا صرف آج ہی آیا۔

میت کو غسل دینے کے بعد کفن پہنانے میں ایک بج گیا۔ تب ایمبولینس آ گئی۔ گاؤں کی طرف روانگی کا آغاز ہوتے ہوتے دو بج گئے۔ ایمبولینس جنازہ لے کر پہلے نکل گئی۔ برادر سجاد اور ڈاکٹر قارب شبیر ائیر پورٹ چلے گئے کہ حاجیوں کو لے کر گاؤں پہنچیں۔ ہم گاؤں کو روانہ ہوگئے۔ ایک کار کو ظہیر ڈرائیو کر رہا تھا اور دوسری کو نصیر عباس، دونوں کو رات کا جگراتا تھا اور اب موسم بھی بہت خوش گوار تھا۔ کہ جس میں 'نیند' ایک خمار بن کر چھپی ہوتی ہے۔ نصیر عباس کو تو سارا دن آنکھ جھپکنے کا بھی موقع نہیں ملا تھا۔ میں اس کی ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ میں نے اسے باتوں میں مصروف رکھا۔ وقفے وقفے کے بعد کار ٹھہرا لیتا اور نصیر یخ ٹھنڈے پانی سے منہ دھو لیتا۔ جب ہم گوجرانوالے سے ادھر ریلوے اوور ہیڈ برج پر سے گزر رہے تھے تو 'کلچڑی' چوکی۔ سڑک پر ٹریفک نہیں تھی۔ ابھی درخت اور کھیت اندھیرے میں ملفوف تھے۔ 'کلچڑی' کی 'چوک' راہی کے لیے آغاز سفر کا پیغام ہوتی ہے جیسا کہ وارث شاہ نے کہا ہے۔

چڑی چوکدی نال اُٹھ ٹرے پاندی
پیاں دودھاں وچ مدھانیاں نیں

ایک 'پاندی' تو صبح کی نقیب چڑیا کی 'چوک' سے پہلے ہی اپنے سفر پر روانہ ہو چکا تھا۔ میر تقی میر نے اس 'منزل' کو زندگی کی 'صبح' کہا ہے۔

عہد جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند
یعنی 'رات' بہت تھے جاگے 'صبح' ہوئی آرام کیا

دوسری کار کا ڈرائیور ڈاکٹر ظہیر الحسن نقوی (پی ایچ ڈی) پچاسویں سال میں ہے۔ مجھے اس کا زیادہ فکر تھا۔ اس کے ساتھ میرا بھتیجا 'ارتضیٰ' بیٹھا تھا۔ اسے میں نے تاکید کی تھی کہ اپنے بھائی کو جگائے رکھنا۔ اس نے بتایا کہ جب بھی کار نے 'پہلو' بدلا تو میں نے بھائی جی کو بیدار کر کے کہا کہ کار روک لیجیے۔ ٹرکوں کے ایک ہوٹل سے کڑک چائے بھی انہیں پلائی۔

ڈسکہ بائی پاس کے چوک پر صبح ہوگئی۔ ایک ہوٹل کھلا تھا۔ اس سے چائے بنوائی اور پی۔ اللہ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ ہم خیر و عافیت سے گاؤں (بھڑتھ) پہنچ گئے۔ آخری سفر کا مسافر ہم سے پہلے یہاں موجود تھا۔ دن کے آٹھ بجے ڈاکٹر قارب شبیر حاجنوں کو لے کر گاؤں پہنچ گیا۔ بخیر و عافیت۔

یکم جون 1994ء کو دس بجے صبح انہیں اپنے آبائی قبرستان میں سپرد خاک کر دیا۔ انہیں اپنی پھوپھی ساس کے پہلو میں جگہ ملی۔ زندگی میں ان کا آپس میں اکثر سلوک اتفاق رہا۔ کم از کم میں نے ساس بہو والی چخ چخ کبھی نہ سنی۔ بہو نے اپنی ساس کی باہر باہر کبھی گستاخی بھی نہ کی۔ گلے شکوے ضرور رہے۔ آپ پہلو بہ پہلو لیٹ کر یہ گلے شکوے بھی دور ہو چکے ہوں گے۔

کس کو معلوم ہے کہ مرنے کے بعد شہر خموشاں کے باسی ایک دوسرے سے ملتے بھی ہیں یا نہیں۔ کوئی وہاں سے واپس نہیں آیا کہ اپنا تجربہ بیان کرے۔ جہاں تک

میرا مطالعہ میرا ساتھ دیتا ہے، میں تو اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ قیامت کے دن شاید ایک دوسرے سے ملاقات کا موقع مل جائے لیکن اس دن نفسی نفسی کا عالم ہوگا۔ ہر ایک کو اپنی ہی فکر ہوگی۔ نامہ اعمال ہاتھ میں ہوگا۔ بیٹا باپ کو نہیں پہچانے گا اور باپ بیٹے کو۔ سب رشتے ناطے ٹوٹ جائیں گے۔ اس لیے جب تک انسان یہاں ہے، اس فرصت کو غنیمت جانے۔

غنیمت ہے یہ دید و وادید یاراں
جہاں مندھ گئی آنکھ میں ہوں نہ تو ہے

(درد)

دو دن کو ان کے 'قل' ہوئے۔ اس شام ہم ہپوگڑھے چلے گئے۔ اگلی صبح لاہور چلے آئے۔ میں 4 جون سے 10 جون تک 174 بدر بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن میں رہا۔ وہاں لاہور کے دوست یار، عزیز و اقربا فاتحہ خوانی کے لیے آتے رہے۔ ان دنوں گرمی بھی شدید تھی۔ 9 جون کو 174 بدر بلاک میں ان کی فاتحہ خوانی ہوئی۔ مرحومہ نے 1983 اپریل سے فروری 1994ء کا بیشتر حصہ اسی مکان میں گزارا تھا۔ جب ہم اس مکان میں آئے، محلّہ زیرِ تعمیر تھا ان کی اپنے ہمسایوں سے بہت دوستی تھی۔ وہ ان کے کام آتی تھیں اور ہمسایہ عورتیں ان سے بہت خوش تھیں۔ چنانچہ جس دن وہ فوت ہوئیں، بدر بلاک سے بہت سے لوگ اس طرف یعنی مکان نمبر 100 بلاک اے 4۔ پنجاب گورنمنٹ ایمپلائز کوآپریٹو سوسائٹی، نزد ٹاؤن شپ میں آئے۔ بدر بلاک اور یہاں کا فاصلہ پندرہ کلومیٹر کے قریب ہے۔ 9 جون کو ہمسائے ختم میں بھی شریک ہوئے۔ نرگس بلاک کی مسجد سے اہل سنت والجماعت امام چند طالب علموں کے ساتھ ختم میں شامل ہوئے۔ جامعہ المنتظر سے حجۃ الاسلام سید شاہد حسین نقوی تشریف آئے۔ اُن کے ساتھ بھی کچھ طالب علم تھے۔ فاتحہ خوانی کی محفل خاصی بھرپور رہی۔ گرمی اس شام بھی بہت تھی۔

10 جون کو میں ادھر آ گیا۔ اتنے دن بہت رونق میں گزرے۔ ہنگامہ شادی میں نہیں، ہنگامۂ غم میں۔ ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق۔ 12 جون سے محرم الحرام کا آغاز ہوا۔ میں عشرہ محرم میں صبح سے لے کر شام تک اکیلا رہتا۔ عزیزہ عترت اور بچیاں مجالس زنانہ سننے کے لیے بدر بلاک چلی گئی تھیں۔ محرم اور تنہائی! میں دوپہر کو اسی کمرے میں سوتا جہاں انہوں نے بیماری کے تین مہینے گزارے تھے، ان کے ساتھ والے پلنگ پر جسے ان دنوں اپنے ساتھی سے کچھ دور کر دیا گیا تھا۔ اس پر ان کی تیماردار بیٹی سویا کرتی تھی۔ اب انہیں پھر ملا دیا گیا تھا۔ ان کا پلنگ خالی رہتا۔ دس پندرہ روز پہلے ان کا جسم اسی پلنگ پر تھا۔ پلنگ موجود ہے لیکن وہ جسم باقی نہیں رہا۔

کئی بار سوتے میں ان کے 'وجود' کا احساس ہوا۔ آنکھ کھلی تو پلنگ خالی پایا۔ ایک عجیب سی نارسائی کا احساس جی کی گھٹن بن جاتا۔ ہمارا دور ''ڈبل بیڈ'' کا دور نہیں تھا۔ چارپائیاں بچھی ہوتیں۔ میاں بیوی الگ الگ چارپائی پر سوتے۔ دونوں کے درمیان فاصلہ بھی ہوتا۔ آخری دم تک قائم رہا۔ 1983ء (مئی) میں ریٹائر ہوا۔ اپریل 1983 میں ہم A-57 پونچھ ہاؤس کوارٹر کو چھوڑ کر ادھر علامہ اقبال ٹاؤن میں آ گئے۔ اس کے بعد ہمیں ایک گھر میں رہنے کا موقع کم ہی ملا۔ اس کے باوجود جدائی کے احساس میں کبھی شدت نہ آئی۔ اب جدائی محسوس ہوتی ہے۔

مرحومہ گھر سنبھالنا جانتی تھی۔ بیمار ہونے سے پہلے وہ بہت کام کرتی تھی۔ ایک خانہ دار خاتون کی ہر خوبی اس میں موجود تھی۔ وہ دوسروں کی خدمت کرتی تھی۔ جب اس کی خدمت کو نظر انداز کیا جاتا، تو وہ غصے میں بھی آ جاتی۔ غصے میں اس کی زبان بہت تلخ بھی ہو جاتی۔ کبھی غیظ و غضب کا سیلاب اس کی ہر خدمت، ہر خلوص کو بہا لے جاتا۔ میں بھی دل گرفتہ ہوتا۔ کئی بار ''تو تو میں میں'' بھی ہو جاتی۔ اب میں محسوس کرتا ہوں کہ کئی بار مجھ سے زیادتی بھی ہو جاتی۔ مجھے افسوس اس بات کا ہے کہ ان کی بے ہوشی اور نیم بے ہوشی کی وجہ سے میں اپنی کسی زیادتی پر بھی ان سے معافی نہیں لے سکا۔

یا موقع ہی نہیں ملا۔

خاندان میں تین افراد ایسے ہیں جن سے وہ بہت خوش رہیں۔

1. میرے والد محترم
2. برادرِ خورد سجاد حسین نقوی (ان کا پھوپھی زاد بھائی اور دُہرا سدھی)
3. شفقت حسین نقوی (چھوٹا بھائی)۔

میرے والد محترم ان کے پھوپھا تھے اور سسر بھی۔ یہ کوئی جذباتی رشتہ نہیں لیکن انہیں ان سے اتنی ہی محبت تھی جتنی اپنے والد سے لیکن والد کے سامنے وہ کبھی کبھار ''اونچا'' بول لیتی تھیں، اپنے پھوپھا اور سسر کے سامنے انہوں نے کبھی اونچے لہجے میں بات نہ کی۔ چھوٹے بھائی شفقت سے ناراض ہو جایا کرتی تھیں لیکن ''محبت'' میں کوئی کمی نہیں آتی تھی۔ سجاد سے انہیں کوئی گلہ بھی ہوتا تو اس کے منہ پر نہ کہتیں۔ سجاد اپنے ایک حالیہ خط (مورخہ 22 جون 1994ء) میں لکھتے ہیں:

> ''سکینہ اور میری اس سے بڑھ کر کیا خوش نصیبی ہے کہ آپا جان نے زندگی بھر ہم سے محبت کی اور ایک واقعہ بھی ایسا نہیں آیا جس میں ہم ایک دوسرے سے ناراض ہوئے ہوں۔ ایسی شفقت اور سعادت مندی شاید ہی کہیں نظر آئے۔''

عزیزہ سکینہ (سجاد کی زوجہ) ان کی سمدھن ہیں۔ جب وہ بیاہ کر لائی گئیں تو ان سے کچھ ترجیحی سلوک ہوا؟ ان معنوں میں کہ وہ ہماری برادری کی ایک خاص شاخ سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان کے رشتے میں کچھ دشواری پیش آئی۔ یہ ماموں زاد اور پھوپھی زاد کا رشتہ نہیں تھا کہ ایک دوسرے کی جھولی میں ڈال دیا جاتا ہے۔ اس کی کچھ زیادہ قدر بھی نہیں ہوتی۔ عزیزہ سکینہ کو کچھ زیور بھی زیادہ پڑے تھے۔ مرحومہ چونکہ خاندان کی سب سے بڑی بہو تھیں، اس لیے ان کے زیور اس شادی کے موقع تک بِک بکا چکے تھے۔ زیور اور ترجیحی سلوک عورت کی کمزوری ہے اور بہت بڑی کمزوری اس سے وہ کیسے

بچ سکتیں۔ چنانچہ نفسیاتی طور پر آخر تک ان کے دل سے یہ خیال نہ نکالا جاسکا کہ میرے ساتھ کمتری کا سلوک ہوا ہے۔ اس کے باوجود میں نے اپنے کانوں سے مرحومہ اور عزیزہ سکینہ کے درمیان کوئی ایسا اونچا مکالمہ نہیں سنا کہ یاد رہ جاتا۔

بہوؤں سے وہ لڑتی جھگڑتی رہیں لیکن بیماری کے آخری دو سالوں میں وہ تین بہوؤں کی خدمت کی معترف ہوگئیں۔ صرف ایک بہو سے وہ خوش نہیں تھیں۔ اس میں اس بہو کا قصور بھی کافی تھا لیکن اس کے شوہر کا قصور زیادہ تھا جو ذہنی طور پر نہایت ناقابل اعتبار آدمی ہے۔ یہ میرا دوسرا بیٹا صغیر الحسن نقوی ہے جو ان کی بیماری کے آخری تین مہینوں میں صرف ایک بار ان سے ملنے آیا اور دوسری بار اس وقت پہنچا۔ جب وہ اس دنیا میں نہ رہیں۔ جب وہ رویا بھی۔ یہ بیٹا ان کے لیے بھی اور میرے لیے بھی مستقل ''آزار'' ہے۔ وہ تو چلی گئیں۔ میں ابھی تک اس 'آزار' کو برداشت کر رہا ہوں۔ اس بیٹے کی طرف سے آج تک کبھی کوئی سکھ کی خبر نہیں ملی۔ اگر بہو کچھ عقل مند ہوتی تو شاید اس کی کچھ اصلاح ہو جاتی۔

طیبہ، عترت اور تطہیر سے وہ خوش گئیں۔ انہیں ''تطہیر'' سے زیادہ پیار تھا۔ پوتوں اور پوتیوں سے انہیں بہت پیار تھا لیکن کسی کی ذرا سی نافرمانی بھی انہیں پسند نہیں تھی۔ 'قنبر' سے انہیں بہت زیادہ پیار تھا۔ 'مونا' کو بھی بہت چاہتی تھیں۔ مشیر عباس کے بچوں کو جو لندن میں ہیں، بہت یاد کرتی تھیں، نجلا اور گوہر سے فون پر ملاقات ہوتی تو رونے لگتیں۔ صغیر کے بچوں سلمان اور میثم کو بھی بہت چاہتی تھیں۔

بلاشبہ یہ زندگی ایک نعمت ہے لیکن تندرستی کے ساتھ۔ تندرستی ہو (جسمانی اور ذہنی) تو دنیا کا ہر منظر اچھا لگتا ہے۔ جب زندگی سے جی بھر جائے تو سبزہ و گل اور نغمہ و شباب سبھی ذہنی آزار میں بدل جاتے ہیں اور لایعنیت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ الحمد للہ کہ میں ابھی اس منزل پر نہیں پہنچا لیکن کبھی کبھار سوچتا ہوں کہ زندگی سے جو کچھ لینا ہے، وہ لے چکا ہوں اور جو کچھ دینا ہے، وہ دے چکا ہوں، اب مزید زندہ رہنے کا فائدہ۔ جب

تک یہ گھر رستا بستا، ہنستا کھیلتا نظر آئے، غنیمت ہے لیکن انسان کو رستے بستے ہنستے کھیلتے گھر سے رخصت ہو جانے کا موقع مل جائے تو اس سے بڑی اور کون سی نعمت ہے۔ چنانچہ میں اب آگے جانے کو راضی ہوں۔ میں نے موت سے بطیّب خاطر سمجھوتا کر لیا ہے۔ میں اسے گلے لگانے کو تیار ہوں۔ بس اللہ سے صرف اتنی دعا کہ موت کی منزل کو محمدص و آلؑ محمد کی طفیل آسان فرما دے۔

اب آخر میں ایک بات کرنی ضروری سمجھتا ہوں۔

جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، قرآن شریف ہدایت و راہنمائی کی کتاب ہے۔ اس سے استخارہ کیا جا سکتا ہے لیکن فال نہیں لینی چاہیے۔ استخارہ بھی ایمان باللہ کو کمزور کرتا ہے اور کسی آئندہ واقعے کے متعلق ''استفسار'' کو تو منطقی اور شرعی کسی لحاظ سے کوئی جواز حاصل نہیں۔ اس کے باوجود میرے اندر کا ازلی و ابدی انسان بہت کمزور ہے۔ وہ معجزے کا طالب اور مافوق الفطرت کا متمنی ہے۔ میں اسے بہت روکتا ہوں، وہ رکتا نہیں۔ میں اسے بہت ذلیل کرتا ہوں لیکن ذلت کے باوجود وہ اپنی قدیمی خصلت سے باز نہیں آتا۔

غلام زہرا بنت مسکین حسین شاہ (زوجہ راقم الحروف) کی حالت دیکھ کر میں اتنا دکھی تھا کہ اس کی موت سے ہفتہ عشرہ پہلے میں پھر قرآن سے 'استفسار' کا مرتکب ہو گیا۔ اللہ میرے گناہ کو معاف کرے۔

جو جس جگہ سے قرآن مقدس کھلا، اس کے دائیں صفحے کی پہلی سطر میں یہ لکھا تھا یٰعِیسٰی اِنِّی مُتَوَفِّیکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ..........''

ترجمہ:

اے عیسیٰ میں ضرور تمہاری مدت پوری کروں گا اور تم کو اپنی طرف اٹھا لوں گا۔ میں جس حمائل یہ حمائل کی تلاوت کرتا ہوں۔ یہ آیت اُس کے صفحہ نمبر 100 کی پہلی آیت ہے۔ جمادی الاول .... بمطابق 15 جون 1974ء کے لگ بھگ طبع

ہوئی۔ طابع پیر محمد ابراہیم ٹرسٹ کراچی ہے۔ ترجمہ مولانا حافظ فرمان علی مرحوم کا ہے۔
(تمت بالخیر)

چند خواب

19 فروری 1996ء

آدمی دن میں بھی خواب دیکھتا ہے اور رات کو بھی۔

اکثر و بیشتر خواب ''اَضغَاثُ اَحلَام'' ہوتے ہیں یعنی خوابہائے پریشان۔ جاگتے ہی ذہن سے محو ہو جاتے ہیں۔ کچھ خواب ایسے ہوتے ہیں جن کے کچھ نقوش لوحِ حافظہ پر محفوظ ہو جاتے ہیں۔ بہت دھندلے۔ ایک دوسرے میں الجھے ہوئے۔ فرائڈ اور ینگ ہی ان کا تجزیہ اپنے اپنے انداز میں کر سکتے ہیں۔

میں نے تھوڑی سی نفسیات پڑھی ہے۔ فرائڈ اور اس کے قبیلے کے نفسیات دان خوابوں کا تجزیہ جن اصولوں کے تحت کرتے ہیں۔ ان کا بھی کچھ کچھ علم ہے۔ ہزارہا خواب فرائڈ کے سمجھائے ہوئے اصولوں پر پورے اترتے ہیں۔ معدودے چند ینگ کے نظریۂ خواب سے بھی ہم آہنگ ہوتے ہیں کہ جن میں اجتماعی لاشعور کی نشاندہی ہوسکتی ہے۔

نفسیات ان خوابوں کا وجود تسلیم نہیں کرتی جن سے مستقبل میں پیش آنے والے واقعات کی خبر ملتی ہو۔ Intution کبھی کبھار پر اسرار مظاہر کی نقاب کشائی ضرور کرتی ہے۔ آج کل پیرا سائیکالوجی پر بہت کام ہو رہا ہے، ممکن ہے کہ اس کے تحت روحانی قوتیں ایسے خوابوں کو بھی جنم دیتی ہوں جو مستقبل نما ہوتے ہیں۔ میرا مطالعہ بہت ہی محدود ہے۔

فرعون کے جس خواب کو اس کے دربار کے دانشوروں نے خواب ہائے پریشان قرار دیا تھا، اس میں حضرت یوسف علیہ السلام نے معنی تلاش کر لیے تھے اور یہ

''خواب'' اگلے چودہ سالوں پر محیط تھا۔

آج سے پچیس تیس سال پہلے کی بات ہے کہ مجھے ایک خواب میں اکثر یہ محسوس ہوتا جیسے میں نے کسی قتل کا ارتکاب کیا ہو، یہ خواب بھیس بدل بدل کر آتا۔ اکثر ایک غیر مرئی سے خوف کی صورت میں۔ جاگنے کے بعد بھی چند لمحوں تک خوف کی کیفیت دماغ میں جاری و ساری رہتی۔ تب میں نے ایک افسانہ ''الصّی'' کے عنوان سے لکھا اور اس کے بعد یہ خواب میں نے پھر کبھی نہ دیکھا۔

یہ افسانہ ''جولائی 1970ء'' میں لکھا گیا اور میرے افسانوں کے مجموعے ''دھوپ کا سایہ'' میں شامل ہے۔

اس کا ایک اقتباس درج ذیل ہے:

''میں اسے اکثر خواب میں دیکھتا ہوں۔ وہ میری طرف ہمک کر آتا ہے اور میری گود اس کے وجود سے بھر جاتی ہے۔ میری چھاتیوں میں دودھ ابل آتا ہے۔''

''آپ کا کوئی بچہ بچپن میں مر تو نہیں گیا تھا؟''

''مرا تو تھا.........لیکن میں نے تو اسے دیکھا تک نہیں تھا۔''

''کیوں؟''

''میں ان دنوں بہاول نگر میں تھا اور وہ بچہ مردہ پیدا ہوا تھا۔ جب میں چھٹی لے کر گھر آیا تھا، تو وہ منوں مٹی کے نیچے دفن تھا۔ اس کی ماں کو بھی جی بھر کر اس کا چہرہ دیکھنا نصیب نہ ہوا تھا کیونکہ اس نے زندگی اور موت کے کنارے کھڑے ہو کر شام کے جھٹپٹے میں اسے دیکھا تھا اور اس کا چہرہ دھندلایا ہوا تھا۔''

یہی بچہ اب آپ کو خواب میں نظر آتا ہے۔

''یہی بچہ؟'' اس نے دہرا کر پوچھا ''شاید.........لیکن میں نے تو اسے دیکھا تک بھی نہیں تھا۔ ان دنوں مجھے بچے کا کوئی خیال نہیں تھا، مجھے زچہ کا زیادہ فکر تھا۔ وہ ہسپتال سے گھر پہنچ چکی تھی، اس کا رنگ زرد تھا اور آنکھوں کے نیچے گہرے سیاہ حلقے

تھے۔ میں اس کی دلجوئی کرتا رہا۔ میں نے اس سے کہا تھا، ہمارا یہ آخری بچہ ہے۔ اس کے بعد میں تمہیں زندگی اور موت کے کنارے پر نہیں پہنچنے دوں گا۔ تم زندہ رہی تو زندگی زندگی ہے۔ وہ رو پڑی تھی۔ اس نے کہا تھا، آپ نے اس بے نام بچے کا مجھے پرسا بھی نہیں دیا۔''

''لیکن میں تو اسے جانتا بھی نہیں۔'' میں نے کہا تھا۔

''میں تو اسے جانتی تھی، پہچانتی تھی۔ وہ نو مہینے میرے پیٹ میں مجھ سے ہم کلام رہا۔ میں نے اکثر اس سے باتیں کیں۔ وہ میرے پیٹ میں حرکت کرتا رہا، پروان چڑھتا رہا۔ وہ آخری لمحے تک زندہ تھا، نہ جانے اس دنیا میں آکر اس نے آنکھیں کیوں نہ کھولیں؟''

''اسے بھول جاؤ۔''

''میں اسے بھول نہیں سکتی۔''

''وہ لوگ جنہوں نے اسے دیکھا ہے، کہتے ہیں کہ وہ بڑا خوبصورت بچہ تھا.........گل گوتھنا......... یوں لگتا تھا، ابھی سویا ہے، ابھی جاگے گا، تو ماں کی گود میں آپڑے گا اور چسر چسر دودھ پینے لگے گا۔''

''بس اب تم آرام کرو۔''

''اس نے قصہ ختم کر کے انصاری صاحب کی طرف دیکھا۔ اُن کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔''

یہ گل گوتھنا بچہ اکثر مجھے خوابوں میں نظر آتا تھا۔ کسی خواب میں اس سے مل کر میں بہت خوش ہوتا، اتنا خوش کہ میرا پورا وجود خوشی کے ان لمحوں میں تحلیل ہو جاتا اور کبھی میں اتنا مغموم ہو جاتا کہ بیدار ہونے پر مجھے اپنی آنکھوں میں نمی کا احساس ہوتا۔

کوئی زمانہ تھا، میں خوابوں میں اُڑا کرتا تھا، کبھی بلندیوں سے پستیوں کی طرف اور کبھی پستیوں سے بلندیوں کی طرف۔ عمودی، نزولی اور افقی ہر طرح کی پرواز۔

اگرچہ ہمالہ کی کسی چوٹی پر تو نہ پہنچا، تاہم اڑان میں رفعت کا احساس ضرور ہوتا۔ اس پرواز میں بہت لطف آتا۔ اس درجہ لطف کہ اس کی کیفیت الفاظ کی سبک باری کو بھی برداشت نہیں کرسکتی۔ نفسیات کے ایک پروفیسر نے جو میرے رفیق کار تھے، بتایا کہ ان خوابوں میں بھی ناآسودہ جنس کا کوئی پہلو موجود ہے۔ انہوں نے جو تجزیہ کیا، وہ مجھے یاد نہیں رہا تاہم خوابوں کی یہ تعبیر مجھے مطمئن نہیں کرسکی تھی۔ اب ایک مدت سے مجھے رفعت پرواز کے یہ خواب نظر نہیں آتے۔ ذہن پر زور ڈالتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ جب دو تین بار مجھے ہوائی جہاز پر لمبا سفر کرنے کا موقع ملا، تو رفعت پرواز کی یہ خواہش پوری ہوگئی۔ ممکن ہے کہ اس میں کوئی اشارہ پرواز تخلیق کا بھی مضمر ہو۔ اگر یہ ٹھیک ہے تو میں تخلیقی طور پر بھی پرواز کی جن بلندیوں کو چھو لینا چاہتا تھا، شاید وہاں تک پہنچ چکا ہوں یا میری پرواز کا افق بہت محدود تھا۔

اکثر خوابوں میں قطعاً کوئی گہرائی نہیں ہوتی۔ خس و خاشاک کو دور کرنے کے بعد آدمی معنی تک پہنچ جاتا ہے اور وہ بھی آسانی سے۔ فیرائڈ اور 'ینگ کا پیروان سے بھی دور کی کوڑی لاسکتا ہے۔ مثلاً رات سخت گرم ہو اور آدمی کو پیاس لگی ہو تو وہ کسی چشمے یا دریا کو خواب میں دیکھتا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وہاں تک پہنچ نہیں سکتا۔ آنکھ کھل جائے تو کولر سے یا گھڑے سے پانی پی کر سیراب ہو جاتا ہے اور یہ خواب نسیاً منسیاً ہو جاتا ہے۔ اب اگر کوئی اس میں معنی تلاش کرے کہ تو چشمے کو ''چشمہ آب حیات'' بھی کہہ سکتا ہے اور ''دریا'' کو ''ہرمن ہیس'' کے اس 'دریا' کا مثیل قرار دے سکتا ہے جہاں سدھارتھا ملاح بن کر آ بیٹھا تھا۔ یوں بھی ''دریا'' رواں دواں اور متحرک زندگیء کا ایک قدیم استعارہ ہے۔

بہاول نگر میں جون 64ء کی ایک رات تھی جب آسمان سے گرم ریت برستی تھی۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ میں پیاسا ہوں اور ایک بہت بڑے تالاب کے کنارے پر کھڑا ہوں لیکن اس کا پانی اتنا گندا ہے کہ پینے کو جی نہیں چاہتا۔ آنکھ کھلی تو

پیاس کی وجہ سے حلق میں کانٹے پڑ رہے تھے۔ میں نے اٹھ کر گھڑے سے پانی پیا اور پھر سو گیا۔ میرا خیال تھا کہ یہ ایک بلی کے چھچھڑوں والا خواب ہے لیکن میرے رفیق کار نفسیات کے استاد نے اس میں بھی جنس تلاش کر لی تھی۔ سوچتا ہوں تو خود بھی کچھ تذبذب میں پڑ جاتا ہوں۔ اگر صرف پیاس کی تسکین مطلوب ہوتی تو جوہڑ کا پانی صاف اور پینے کے لائق ہونا چاہیے تھا یا چشمہ یا بہتا ہوا پانی نظر آنا چاہیے تھا۔ لاشعور کی معدن کو کھودا جائے تو ضروری نہیں کہ اس سے لعل و جواہر ہی برآمد ہوں۔

کوئی لازمی نہیں کہ دریا خواب میں نظر آئے تو اس سے تشنہ لبی کا مداوا بھی ہو سکے۔ ہو سکتا ہے کہ پیاسا اس تک پہنچے تو وہ سراب بن جائے یا دریا کے کنارے اتنے عمودی ہوں کہ پانی تک پہنچنا ممکن یا اتنے پھسلواں کہ دریا میں گرنے کا اندیشہ ہو۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ فرات کے کنارے چند تشنہ لبوں کو ہونٹ تر کرنے کے لیے دو چار قطرے بھی نہ مل سکے۔

تشنہ لب آؤ، تشنہ لب جاؤ
زندگی ہے فرات کا دریا

(بشیر احمد بشیر)

دریا کے حوالے سے میں نے ایک رات اتنا خوبصورت خواب دیکھا کہ جاگ کر بھی دیر تک اس کے طلسم سے آزاد نہ ہوا۔ ایسا لگا جیسے میں کسی سفر پر نکلا ہوں۔ اس سفر میں سفر والی کوئی بات نہیں تھی لیکن اس کی منزل بھی متعین نہیں تھی۔ عجیب بات ہے کہ مجھے یہ سفر بے مقصد بھی معلوم نہیں ہو رہا تھا۔ اس میں سیر و سیاحت کا عنصر بھی واضح نہیں تھا۔ پتا نہیں کن سڑکوں اور پگڈنڈیوں پر سفر کیا۔ کبھی راستے میں ٹیلے آئے بلکہ مٹی کے تودے اور کبھی ہموار چٹیل میدان۔ پھر اچانک ایک ایسی شاہراہ پر پہنچا جو ایک دریا کے متوازی چل رہی تھی۔ متوازی کہوں یا یہ کہ دریا کے کنارے پر بنی تھی اور دریا بھی طوفانی۔ پاٹ اتنا وسیع کہ دریا کا دوسرا کنارا نظر نہیں آتا تھا۔ سڑک کنکریٹ کی بنی

ہوئی۔ کبھی کبھار دریا میں اتنی بڑی لہر اٹھتی اور سڑک سے ٹکراتی کہ میں اپنے پاؤں میں کپکپاہٹ محسوس کرتا۔ میں دریا کی الٹی سمت میں چل رہا تھا اور سفر سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اچانک دریا کے ایک موڑ پر سڑک اس میں غائب ہوگئی۔ دریا پر کوئی پل نہیں تھا اور دوسرا کنارہ نظر نہیں آتا تھا۔ پھر اچانک آسمان پر بادل چھائے او پھوار پڑنے لگی۔ میں نے اپنے آپ کو ایک نہایت سرسبز پارک میں ایک چھتر کے نیچے پناہ گزیں پایا.......... میری آنکھ کھلی تو میں نے اپنے آپ کو سرشاری کی کیفیت میں ڈوبا ہوا محسوس کیا.......... سفر کے ادھورا رہ جانے کا مجھے کوئی افسوس نہیں تھا.......... سفر کے بعد سکون کی کیفیت اتنی گہری تھی کہ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں بہت ہلکا پھلکا ہوگیا ہوں.......... اس ''خواب'' میں خس و خاشاک بہت کم تھا۔ جتنا حصہ یاد رہا، وہ اب بھی حافظے کی سکرین پر صاف اور واضح نظر آتا ہے.......... ایک عرصے تک میں اس کی کیفیت کو بھی اپنے اوپر طاری کر لیتا تھا لیکن اب ایسا نہیں ہوتا۔

مجھے معلوم ہے کہ اس خواب میں بہت سی علامتیں اتنی عام ہیں کہ ان میں علامتی ابہام و غرابت اور باقی نہیں رہے۔ یہ سفر ادھورا ہے۔ اگر اس کی تکمیل لازمی ہوتی تو دریا کے اس موڑ پر پل ضرور ہوتا۔ دریا پار ہو جاتا تو گویا ایک منزل سر ہو جاتی۔ صرف اتنی بات میری سمجھ میں نہیں آسکی کہ میں دریا کی الٹی سمت میں سفر کیوں کر رہا تھا اور دریا طوفانی کیوں تھا؟ میں اس کا تجزیہ بھی نہیں کرنا چاہتا کہ پھول کی پتیاں بکھر جائیں تو پھول پھول نہیں رہتا۔

جو خواب خوشی بخشتے ہیں، ان میں کوئی دلکشا منظر نظر آتا ہے یا کوئی نغمہ سنائی دیتا ہے یا کوئی خوشبو مشام جان کو تر و تازہ کر دیتی ہے۔ نغمہ اور خوشبو والا خواب اپنے اندر تجرید کی خصوصیت رکھتا ہے۔ نغمہ گانے والا نظر نہیں آتا اور ''از کجا می آید ایں آوازِ دوست'' والی کیفیت میں جو پراسرار انبساط پوشیدہ ہے، اسے سامع ہی بہتر جانتا ہے۔ خوشبو کی تجرید اس صورت میں ہوتی ہے کہ اس کا منبع نظر نہیں آتا۔ نہ کوئی کلی چٹکتی ہے، نہ کسی عطر

دانی کا کاک اُڑتا ہے۔

این ٹی ایم پر ایک سیریز ''مسٹری تھیٹر'' کے عنوان سے لگی تھی۔ اس کی ایک کہانی میں ایک لڑکے کی ''روح'' دکھائی گئی تھی جو گٹار پر ایک نغمہ گاتا ہے۔ یہ ایک پنجابی عارفانہ کلام ہے جسے ''خالد النعم'' نے گایا ہے۔ اس کی طرز میں کمال کی تاثیر ہے۔ یہ کلام میں نے اپنے بچپن اور جوانی میں بھی سنا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ طرز بدل چکی ہے۔ اس کے دو مصرعے یا بیت مجھے یاد ہیں۔

تیری ڈاچی دے گل وچ ٹلیاں
وے میں پیر مناون چلی آں
میرے ہتھ گری دیاں ٹھوٹھیاں
پیرا توں سچا میں جھوٹھی آں

ایک عرصہ بعد خواب میں ''آوازِ دوست'' سنی اور ان بیتوں کے روپ میں۔ اس نغمے نے اتنی خوشی بخشی کہ وہ آنسوؤں میں تر ہوگئی۔

صبح کی نماز کے بعد میں نے پہلا بیت خود گنگنایا تو میں حیران ہوا کہ مجھے نغمے کی طرز اور لے پر پورا عبور تھا اور میری آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔

ان دنوں سلطان باہوؒ کا یہ شعر حالت بیداری میں سنتا بھی ہوں اور گاتا بھی ہوں۔ یہ شعر بھی میرے روح میں رَچ بس گئے ہیں لیکن عجیب بات ہے کہ ابھی خواب کی صورت میں ان کی تجرید نہیں ہوئی۔

الف اللہ چنبے دی بوٹی مرشد من وچ لائی ہُو
نفی اثبات دا پانی ملیا ہر رگے ہر جائی ہُو

کچھ خواب کثیف ہوتے ہیں، کچھ لطیف۔ جب آدمی کا پیٹ بھرا ہو اور معدے میں گرانی ہو تو خواب بہت غلیظ ہوتے ہیں۔ ایسے خواب دیکھ کر روح میں بہت گرانی پیدا ہوتی ہے۔ خوابوں کی لطافت و کثافت کا موازنہ و مقابلہ کیا جائے تو ایسی

بلندی، ایسی پستی، کی تفسیر نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے۔ ''احسن التقویم'' اور ''اسفل السافلین'' میں فاصلے اور مسافت کا جو فرق ہے، وہ بظاہر ''قطبین'' کا فرق ہے لیکن غور کیا جائے تو دونوں کے درمیان صرف ایک موہوم سی لکیر حائل ہے۔

گہے برطارم اعلیٰ نشیم

گہے بر پشت پائے خود نہ بینم

وہ خواب جو انسان پر خوف طاری کرتے ہیں کثیف خوابوں کی ذیل میں آتے ہیں۔ مجھے دوسروں کا حال معلوم نہیں البتہ اپنے متعلق یہ کہہ سکتا ہوں کہ غم اور خوف طاری کرنے والے خواب خوشی اور مسرت بخشنے والوں خوابوں کی نسبت تعداد اور مقدار میں کہیں زیادہ ہوتے ہیں۔

میں اخبار پڑھ کر یا ٹیلی ویژن کی خبریں دیکھ کر روحانی طور پر جس خلفشار میں مبتلا ہوتا ہوں، وہ رات کو کثیف خوابوں میں ڈھلتا ہے، تو ان کے بیان کی جرأت اپنے اندر نہیں پاتا۔ میں انہیں بھول جاتا ہوں۔ قدرت کی انسان پر یہ بہت بڑی مہربانی ہے کہ اسے بھولنے کی قدرت حاصل ہے لیکن کیا یہ خواب مٹ مٹا جاتے ہیں؟ نہیں............ لاشعور ایک ایسا بلیک ہول ہے جو ان کی راکھ کو محفوظ رکھتا ہے۔ بلیک ہول میں گرا ہوا کوئی اجرام فلکی پھر سے زندگی نہیں پاتا لیکن لاشعور جب چاہے، جس وقت چاہے اس راکھ میں زندگی ڈال دیتا ہے۔ ایک خواب اس لمحے بھی میرے ذہن میں موجود ہے۔ میں اسے کاغذ پر منتقل کرسکتا ہوں، لیکن نہیں کروں گا۔ میں آپ کو بھی اور اپنے آپ کو بھی اذیت میں کیوں مبتلا کروں؟

بعض خوابوں میں خوف کی بھی تجرید ہوجاتی ہے۔ تجرید سے مراد یہ ہے کہ ان خوابوں کو جنم نہیں ملتا۔ یوں لگتا ہے جیسے کوئی بلا انسان کے عقب میں چل رہی ہو۔ اس کے قدموں کی چاپ بھی نہیں آتی۔ آدمی بھاگتا ہے لیکن اس کے پاؤں زمین سے چپک چپک جاتے ہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ میں خواب میں اڑ سکتا ہوں لیکن دوڑ نہیں سکتا۔

جب خواب گزر جاتا ہے تو جسم تھکا تھکا سا معلوم ہوتا ہے۔

بزرگ کہا کرتے تھے کہ رات کو سونے سے پہلے کلمہ پڑھ لینا چاہیے۔ اگر آیت الکرسی یاد ہو، تو اسے پڑھ کر سینے پر دم کر لینا چاہیے۔ بائیں کروٹ سونا اچھا نہیں ہوتا۔ دائیں کروٹ سونا بہتر ہے۔ چت لیٹا ہو تو دل کی جگہ پر ہاتھ نہ رکھے۔ میں جانتا ہوں کہ نیند کی بے ہوشی میں کہ جسے عارضی موت کا نام دیا جاسکتا ہے، ان ہدایات پر عمل نہیں ہوسکتا۔ میں بھی ایک مدت سے بزرگوں کی صف میں داخل ہو چکا ہوں۔ شاید اپنے ہم عصر بزرگوں میں میں اکیلا آدمی ہوں کہ اپنی بزرگی کا اعتراف برملا کر رہا ہوں۔ بہر حال میرا تجربہ ہے کہ یہ ہدایات ذہن میں ہوں تو آدمی عفریتی خوابوں سے کچھ نہ کچھ محفوظ ضرور رہ سکتا ہے۔

ایک عرصے سے میں دو قسم کے خواب دیکھ رہا ہوں۔ مراجعاتی خواب اور بے سروسامانی کے خواب۔ ظاہر ہے کہ مراجعت 'ماضی' میں ہوتی ہے۔ کبھی زمانی اور کبھی مکانی۔ دونوں نوع کی مراجعت میں کبھی خوشی ملتی ہے اور کبھی ہلکا سا غم۔ 'بچپن' میں مراجعت اکثر خوشی عطا کرتی ہے۔ 'جوانی' میں مراجعت ناآسودگی کے غم میں مبتلا کرتی ہے۔ ''ادھیڑ عمر'' میں داخل ہو کر اپنی کوتاہیوں اور نارسائیوں کا افسوس ہوتا ہے۔ اکثر اپنے گاؤں کو لوٹتا ہوں اور گاؤں بھی بچپن کا گاؤں۔ اس کی گلیاں تنہا تنہا ہوتی ہیں۔ ہر نئے خواب میں گاؤں کے ابعاد (Contours) بدل جاتے ہیں۔ اس کا حدود اربعہ بھی تبدیل ہو جاتا ہے۔ دو چار بار میں نے دیکھا کہ ایک چھوٹے گیج کا ریلوے ٹریک سیالکوٹ شہر کے سٹیشن سے شروع ہو کر اس کچی سڑک کے متوازی چل رہا ہے جس کے دونوں کناروں پر شیشم کے بوڑھے درختوں کا سایہ تھا۔ یہ ٹریک چھاؤنی میں سے گزر کر میرے گاؤں کے کنارے کنارے ہوتا ہوا دریائے چناب تک چلا گیا ہے۔ یہ میرا خیال ہے ورنہ خواب میں یہ دُور درختوں کے جھنڈ میں غائب ہو جاتا تھا۔ میں نے اس پر ایک خوبصورت چھوٹے چھوٹے ڈبوں والی ٹرین کو چلتے دیکھا اور سنا ہے۔ اس کا ننھا سا

دُخانی انجن بھی بہت خوبصورت تھا۔

میں ان دنوں گاؤں جاتا ہوں تو چھاؤنی کی آخری سڑک سے کم از کم میل ڈیڑھ میل کے فاصلے تک مجھے اس کے کنارے کوئی بوڑھا شیشم کا درخت سایہ فگن نظر نہیں آتا۔ کم از کم تین فرلانگ تک اس کے دونوں کناروں پر دکانیں اور مکان ہیں اور ایک درخت بھی باقی نہیں رہا۔

ننھی منی ٹرین کا یہ منظر میں بچپن میں بھی دیکھا کرتا تھا۔ بچپن کا خواب کچھ اور معنی رکھتا تھا لیکن ادھیڑ عمر اور بڑھاپے میں بچپن اور گاؤں کی طرف لوٹنا ایک زمانی و مکانی مراجعت ہے۔ درخت اور گاڑی یقیناً علامتیں ہیں۔ ان کا تجزیہ ہو سکتا ہے لیکن اس کا فائدہ؟ بہتر ہے کہ خواب خواب ہی رہیں۔

میرے لڑکپن اور جوانی کے ایک دو سال دیپالپور میں گزرے ہیں۔ یہ ایک تاریخی شہر ہے۔ ایک اونچے ٹبے پر واقع ہے۔ نہ جانے موجودہ شہر کے نیچے کتنے اور شہروں کے کھنڈر دبے ہوئے ہیں؟ اس شہر کی تین اطراف کی فصیل اور خندق کے آثار اب بھی موجود ہیں۔ تین بڑے دروازے ہیں۔ میں اپنے والد مرحوم کے ساتھ مغربی دروازے کے اوپر بنی پرانی عمارت میں رہتا تھا۔ یہ سکول کا بورڈنگ ہاؤس تھا۔ اس شہر کی جنوبی سمت کی فصیل ٹوٹ پھوٹ چکی تھی اور دروازے کا نام ونشان بھی باقی نہیں تھا۔ کبھی کبھار مجھے اس قصبے کی فضا بہت پُراسرار محسوس ہوتی۔

کبھی میں خوابوں میں اس شہر میں بھی پہنچ جایا کرتا تھا اور اس مراجعت میں ایک عجیب سی جذباتی تسکین محسوس ہوتی تھی۔ اپنے نقوش پا پر چلنے میں بہت لطف آتا تھا۔ کئی بار ان گلیوں میں چلا جن سے گزر کر میں سکول جاتا تھا۔ ان سے مجھے ماضی کی پُراسرار آوازیں سنائی دیتیں۔ ایسا لگتا جیسے میں یہاں اپنے لڑکپن اور جوانی کے آثار تلاش کر رہا ہوں۔

آج سے غالباً بارہ تیرہ سال پہلے کی بات ہے، میں دیپالپور گیا۔ دیکھا کہ

اندر کا قدیم شہر سنسان ہو چکا ہے۔ مکان ہیں لیکن مکینوں سے خالی معلوم ہوتے ہیں۔ بازاروں میں دکانیں ہیں لیکن اکثر پر تالے لگے ہوئے۔ تقریباً سارا شہر فصیلوں سے باہر آباد ہو گیا ہے۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں الف لیلیٰ کے اس شہر میں آ گیا ہوں جسے عفریت کا خوف سنسان و ویران کر گیا تھا۔ ایک پرانے دوست سے ملا۔ وہ جسمانی طور پر بھی اور روحانی طور پر بھی بدلے ہوئے نظر آئے۔ میں دیپالپور سے لوٹا تو بہت اداس اور مغموم تھا۔ اس وقت سے لے کر اب تک مجھے خواب میں بھی دیپالپور جانے کی ہمت نہیں ہوئی۔

وہ خواب جن میں مستقبل کے کسی لمحے یا منظر کی تجرید و تجسیم ہو جاتی ہو، بہت نادر (Rare) ہوتے ہیں۔ ایک دو بار ایسا محسوس ہوا ہے کہ عالم بیداری میں زمان و مکاں کے کسی مظہر میں مجھے اپنا ماضی نظر آیا ہے یعنی ایسا لگا جیسے میں ''اس لمحے'' سے پہلے بھی آشنا تھا یا یہ لمحہ مجھ پر پہلے بھی وارد ہو چکا ہے۔ یہ احساس اتنا موہوم ہوتا ہے کہ کسی تجریدی نظم میں ہی سما سکتا ہے۔

اپنے دو افسانوں ''وہ'' اور ''سرگوشی'' کا ذکر کروں گا جہاں یہ ''لمحات'' تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ جہاں تک ''مکان'' کا تعلق ہے۔ کھوٹے کے قیام کے دوران دو بار ایسا محسوس ہوا جیسے میں نے ان مقامات کو پہلے بھی دیکھا ہو۔ کھوٹے سے جو سڑک آزاد پٹن کی طرف جاتی ہے۔ ہم کچھ دوست سیر کرتے کرتے یہاں تک پہنچے، پھر ایک پگڈنڈی پر ہو لیے اور اس پہاڑ کی چوٹی تک جا پہنچے جس کے دامن میں گاؤں آباد ہے۔ یہاں ایک سرسبز اور تقریباً ہموار سی جگہ تھی جہاں سبز گھاس کا فرش بچھا تھا۔ اوپر چیڑھوں کا سایہ تھا اور ہوا میں ہلکی سی لرزشیں تھیں۔ چڑھوں کی جھانجھنیں بج رہی تھیں اور عجیب کیف کا سماں تھا۔ غنودگی کے عالم میں محسوس کیا کہ میں اس جگہ پر پہلے بھی کبھی آیا تھا۔

دوسری بار اسی سڑک پر پنجاڑ پہنچے اور ایک پگڈنڈی پر ہو لیے۔ جب ایک پہاڑ کی چوٹی پر پہنچے تو دور نشیب میں دریائے جہلم دھوپ میں چمک رہا تھا۔ نقرئی ساکن

سی چمک کہ جس نے مسحور کر دیا۔ ایسا لگا جیسے میں نے اس دریا کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔

نیم بیداری میں نظر آنے والے پہلے خواب کی میں آسانی سے توجیہہ کر سکتا ہوں۔ مین تین سال کی عمر تک پہاڑی علاقے میں رہا جہاں چیڑھیں تھیں۔ ان کا ہلکا سا سایہ اب تہتر سال کی عمر میں بھی حافظے کے کسی کونے سے چسپاں محسوس ہو رہا ہے۔ 'دریا' والے منظر کی توجیہہ نہیں کر سکتا۔

سخت گرمیوں میں اب بھی مجھے پہاڑوں اور ان پر چیڑھوں کے ترنم سایوں کے خواب آتے ہیں۔ خواب ہی خواب میں ساری گرمیاں پہاڑوں پر گزر جاتی ہیں۔

1962ء کا اپریل کا مہینہ تھا کہ میں جھنگ سے سرگودھا بس پر جا رہا تھا۔ دریائے چناب کے پل تک اس سڑک پر دونوں طرف گھنا سایہ ہے۔ دائیں طرف میری نظر پڑی تو میں نے دیکھا کہ سڑک کے متوازی ایک چھوٹا سا راجباہ یا کھال بہہ رہا ہے۔ معاً مجھے ایسا لگا جیسے میں نے اس منظر کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔ ڈسکے میں آٹھ نو سال مسلسل رہنے کے بعد میرا دل کہہ رہا تھا کہ اب یہاں سے دانہ پانی اٹھنے والا ہے۔ ڈسکہ مجھے بہت پسند تھا۔ اس منظر کو میں نے خواب میں دیکھا لیکن اس میں مجھے کوئی ندرت یا مزابت محسوس نہ ہوئی تھی۔

ان دنوں میں جو خواب دیکھ رہا ہوں، نہایت بے سروپا ہوتے ہیں۔ اکثر میں عجیب قسم کی بے سروسامانی کے عالم میں ہوتا ہوں۔ نقل مکانی، نقل زمانی اور ان پر مستزاد بے سروسامانی ایسے خواب دیکھ کر انتہائی دل گرفتگی کی اذیت میں مبتلا ہو جاتا ہوں۔ ایک سفر میں مستقل طور پر گرفتار محسوس ہوتا ہوں کہ زمانہ ماضی کی طرف لوٹ جاتا ہوں اور ایک ایسے شہر کے سکول یا کالج میں پڑھانے پر مامور ہوتا ہوں، جس کا ماحول اور جس کی فضا دل کو اداس کرتے ہیں۔ کسی شہر میں رہنے کو مکان نہیں ملتا، کسی شہر کی گلیاں اتنی تنگ اور ٹیڑھی بینگی ہیں کہ ان میں کھو کر بھول جاتا ہوں کہ یہاں کیوں آیا۔ عام طور پر اکیلا

ہوتا ہوں، اکثر اس مکان کا اتا پتا بھول جاتا ہوں، جہاں میری رہائش ہے۔ یکا یک ایسا معلوم ہوتا کہ تن پر پورے کپڑے بھی نہیں۔ قمیض ہے تو شلوار نہیں۔ اس نیم عریانی پر دل تنگ ہوتا ہے۔شرم بھی آتی ہے۔ پاؤں میں جوتے تو اکثر غائب نظر آتے ہیں۔

ان خوابوں کا چونکہ تجزیہ نہایت آسان ہے، اس لیے جاگنے پر دل تنگی کا احساس فوراً زائل ہوجاتا ہے۔ انسان اور زادِراہ ملازم وملزوم ہیں۔ یہ یقین ہماری نفسیات کا ایک ''آرکی ٹائپ'' ہے کہ ہر سفری کا اسباب راہ ہی میں لٹ جاتا ہے۔ وہ یہاں سے جاتا ہے تو سکندر کی طرح خالی ہاتھ۔ نیم عریانی کی توجیہہ بھی اس یقین کے اندر مضمر ہے۔

اب میں اپنے اس خواب کو بیان کرتا ہوں جس کے لیے مجھے اتنا لمبا مضمون لکھنا پڑا۔ یہ خواب میں نے 17 اور 18 فروری 1996ء کی درمیانی رات میں دیکھا۔

میں نے دیکھا مکہ میں حالت سفر میں ہوں۔ اگرچہ نیم عریانی کا عالم تو نہیں لیکن بے سروسامانی ضرور لاحق ہے۔ یہ بھی معلوم نہیں کہ کہاں جانا ہے۔ ایک خوف لاحق ہے کہ منزل دور ہے اور زادِراہ کے کم پڑنے کا اندیشہ بھی ہے۔اب یاد نہیں رہا کہ کہاں کہاں بھٹکتا پھر رہا ہوں کہ اچانک میرے والد مرحوم میرا ہاتھ تھام لیتے ہیں۔ وہ مجھ سے یہ نہیں پوچھتے کہ تم کہاں جانا چاہتے ہو۔ ایک عمارت کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ وہ رہا اسٹیشن۔ یہاں سے ہم گاڑی پر سوار ہوں گے۔

گھپ اندھیرے میں معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی دیہاتی سا سٹیشن ہے جہاں سے تیز رفتار گاڑیاں ٹھہرے بغیر چلی جاتی ہیں۔ اس کی ٹکٹ والی کھڑکی میں مدھم سی روشنی ضرور ہے لیکن ٹکٹ بابو نظر نہیں آتا۔ سوچتا ہوں کہ ٹکٹ کون دے گا۔ میرے والد کہتے ہیں، تم پلیٹ فارم پر چلو۔ میں ابھی ٹکٹ لے کر آتا ہوں۔ پلیٹ فارم پر گھپ اندھیرا ہے۔ اس دبیز اندھیرے میں مجھے گاڑی کے آنے کی آواز آتی ہے۔ چھک چھک۔ پھر بریکیں لگتی ہیں۔ یہ محسوس ہوتا ہے کہ گاڑی پلیٹ فارم پر کھڑی ہوگئی ہے۔

اس کے کسی ڈبے میں روشنی نہیں۔ میں اپنے دل پر بہت دباؤ محسوس کرتا ہوں کہ گاڑی چل جائے گی اور والد صاحب ٹکٹ لے کر نہیں آئے۔ تب گاڑی کے چلنے کی آواز آتی ہے اور پلیٹ فارم کا اندھیرا بہت گہرا ہو جاتا ہے اور اس اندھیرے میں میں اپنے آپ کو تنہا پاتا ہوں اور بہت اداس۔ اب اس لمحے بھی میں اپنے آپ کو اندھیرے پلیٹ فارم پر یکہ و تنہا پا رہا ہوں۔

غلام الثقلین نقوی

22 فروری 1996ء

ایک لاکھ آدم

امام محمد باقر علیہ السلام کا ارشاد ہے جسے جناب شیخ صدوقؒ بابویہ قمی نے ''خصال'' میں وارد کیا ہے کہ

''اللہ نے ہزار ہزار عالم پیدا کیے ہیں اور ہزار ہزار آدم''

اہل سنت کے طریق سے ہے۔

''پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے کہ اللہ نے ان آدم کے پہلے جو عام طور پر معلوم ہیں ایک لاکھ آدم پیدا کیے۔''

اس اس مضمون کی روایت امام جعفر صادق علیہ السلام سے بھی ہے۔

امام ابواللیث نے اپنی تفسیر میں جناب ابن عباسؓ کے واسطے سے پیغمبر خدا کی حدیث درج کی ہے کہ اللہ کے اٹھارہ ہزار عالم ہیں اور تمہاری دنیا ان میں کا ایک عالم ہے۔ (تفسیر فصل الخطاب جلد اول۔ صفحہ 28)

ایک خواب اور اس کی حیرت انگیز تعبیر

22 فروری 1996ء

ابن ابی الحدید نے معد ابن فخار سے نقل کیا ہے کہ ایک رات شیخ مفیدؒ نے

خواب دیکھا کہ جناب فاطمہ زہرا اسلام اللہ علیہا حسن اور حسین علیہم السلام کے ہمراہ مسجد کرخ میں تشریف لائیں اور ان سے خطاب کر کے فرمایا کہ اے شیخ! میرے ان بچوں کو علم فقہ و دین پڑھاؤ۔ شیخ جب خواب سے بیدا ہوئے تو حیرت و استعجاب نے گھیر لیا اور ذہن خواب کی تعبیر میں الجھ کر رہ گیا۔

اسی عالم میں صبح ہوئی۔ دیکھا کہ فاطمہ بنت الحسین ☆کنیزوں کے جھرمٹ میں تشریف لا رہی ہیں اور ان کے دونوں بیٹے سید مرتضیٰؒ اور سید رضیؒ ان کے ہمراہ ہیں۔ شیخ انہیں دیکھ کر تعظیم کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔

جب وہ قریب آئیں تو فرمایا ''اے شیخ! میں ان بچوں کو آپ کے سپرد کرنے آئی ہوں۔ آپ انہیں علم دیں پڑھائیں۔''

یہ سن کر رات کا منظر ان کی نظروں میں پھرنے لگا۔ مجسم تعبیر نگاہوں کے سامنے آ گئی۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور ان سے رات کا خواب بیان کیا جسے سن کر سب دم بخود رہ گئے۔

(نہج البلاغہ ترجمہ مفتی جعفر حسین۔ ص 57)

☆ یہ خاتون سید مرتضیٰؒ اور سید رضیؒ کی والدہ ماجدہ تھیں۔ سید مرتضیٰ اپنے عہد کے بہت بڑے شیعہ عالم اور مجتہد تھے۔ سید رضی ان کے چھوٹے بھائی بہت بڑے عالم ہونے کے علاوہ عربی کے بہترین انشا پرداز تھے اور ''نہج البلاغہ'' کے مولف تھے۔

(359 ہجری تا 406 ہجری)

بھلائی اور برائی

27 فوری 1996ء

اور بھلائی برائی (کبھی) برابر نہیں ہو سکتیں۔ تو (سخت کلامی کا) ایسے طریقے سے جواب دو جو نہایت اچھا ہو۔ (ایسا کرو گے) تو تم دیکھو گے) کہ جس میں اور تم میں

دشمنی تھی گویا وہ تمہارا دل سوز دوست ہے۔ (آیت 22۔ سورہ حم السجدہ۔ پارہ 24۔ ترجمہ از حافظ سید فرحان علی مرحوم)

اور بھلائی اور برائی یکساں نہیں ہیں، تم برائی کا دفعیّہ زیادہ سے زیادہ بھلائی سے کرو تو ایک دم یہ نتیجہ ہوگا کہ تمہارے اور جس کے درمیان دشمنی ہے، وہ ایسا ہو جائے گا جیسے وہ بڑا جگری دوست ہے۔ (فصل الخطاب۔ سید علی نقی)

ایک شعر

27 فروری 1996ء

کریم! جو تجھے دینا ہے بے طلب دے دے
فقیر ہوں، پہ نہیں عادت سوال مجھے

(میر انیس اعلی اللہ مقامہ)

غالب کا ایک شعر

28 فروری 1996ء

میں اپنی پوتی عقیلہ زینب نقوی جماعت ہفتم کو ایک غیر ملکی انگریزی نصاب کا ایک سبق پڑھا رہا تھا جس کا عنوان ہے (Rapids) اس میں ایک ترکیب آئی (Pulverized Water)۔ عنوان اور ترکیب دونوں کے معنی ڈکشنری سے تلاش کرنے پڑے۔

(Rapids) کے معنی ہیں ڈھلوان۔ پہاڑی ندی جب اچانک نشیب میں تیزی سے گرتی ہے تو ایک آبشار کا سا منظر پیدا ہو جاتا ہے۔ جب پانی چٹان سے ٹکراتا ہے تو وہ قطروں میں بٹ جاتا ہے۔ اسے مصنف نے (Pulverized Water) کہا ہے۔ اس سے میرا ذہن غالب کے مندرجہ ذیل شعر کی طرف منتقل ہو گیا۔

قطرہ مے از بسکہ حیرت سے نفس پرور ہوا
خط جام مے سراسر رشتۂ گوہر ہوا

اصل میں ہوا یہ کہ تلازمہ خیالات کی گاڑی کی کئی اسٹیشنوں پر ٹھہرے بغیر سرعت سے گزر گئی۔ ایک سٹیشن جہاں اسے پہلے ٹھہرنا تھا، بعد میں میرے ذہن میں آیا۔ چنانچہ گاڑی کو پیچھے آنا پڑا۔

اقبالؔ نے ''فلسفہ غم'' میں ڈھلوان پر آبشار بناتی ہوئی پہاڑی ندی کا جو منظر کھینچا ہے، وہ مندرجہ بالا انگریزی لفظ اور ترکیب پر نہایت موزوں طور پر منطبق ہوتا ہے۔

آتی ہے ندی جبین کوہ سے گاتی ہوئی
آسماں کے طائروں کو نغمہ سکھلاتی ہوئی
آئینہ روشن ہے! اس کا صورت رخسارِ حور
گر کے وادی کی چٹانوں پر یہ ہوجاتا ہے چور
نہر جو تھی اس کے گوہر پیارے پیارے بن گئے
یعنی اس افتاد سے پانی کے تارے بن گئے
جوئے سیماب رواں پھٹ کر پریشان ہوگئی
مضطرب بوندوں کی اک دنیا نمایاں ہوگئی

میں نے اس بند کے آخر کے اشعار نقل نہیں کیے کیونکہ ان کے اندر چھپے ہوئے فلفسیانہ نکتے کی گرہ کشائی مقصود نہ تھی۔

غالبؔ کے شعر میں یہی منظر Miniature مصوری کی صورت میں پیش ہوا ہے۔ شراب کے پیمانے میں پیگ (Peg) کے خط لگے ہوتے ہیں۔ کئی شیشے کے گلاس ایسے ہوتے ہیں جن میں مدوری خطوط لگے ہوتے ہیں۔ غالب کے مشاہدے کی باریکی اور لطافت ملاحظہ ہو کہ شراب کا ایک قطرہ دائرے کے اس محیط پر اٹکا اور پھر ٹوٹ گیا۔

ٹوٹ کر بھی وہ ناپید نہیں ہوا بلکہ ''رشتۂ گوہر'' بن گیا یعنی موتیوں کی مالا۔ گویا قطرے نے اپنے ''وجود'' کو بکھیرا ضرور لیکن مٹنے نہیں دیا۔ یہ گویا اس کی ''نفس پروری'' ہے یعنی ''حفظہ خودی''۔ سارے شعر میں ''حیرت'' کا ایک ایسا لفظ ہے جس کی شعر میں موجودگی میری سمجھ میں نہیں آسکی۔ سالک اپنے روحانی سفر میں ایک منزل پر پہنچ جاتا ہے جسے ''منزل حیرت'' کہتے ہیں۔ ممکن ہے غالب کی مراد اسی منزل سے ہو کہ جہاں وہ ٹھٹک کر کھڑا ہو جاتا ہے۔

اقبالؔ کی 'جوئے کوہسار' پھٹ کر پریشاں ضرور ہوتی ہے لیکن دو قدم پر جا کر پھر اپنے ''وجود'' کو پا لیتی ہے۔ ''خودی'' کی حفاظت کا تصور یہاں بھی موجود ہے۔

12 مارچ 1996ء

کل رات بارہ بجے عمر عزیز کے تہتر سال بیت گئے! یہ کوئی ایسا واقعہ یا سانحہ یا حادثہ نہیں کہ جس کی گونج کسی اور نے سنی ہو۔ ایک کنکر بحر نا پیدا کنار میں گرا اور گم ہو گیا۔ اس کی آواز میں نے بھی نہ سنی۔

اس سال کوئی بڑا یا چھوٹا کارنامہ مجھ سے سرانجام نہ ہوسکا۔ دو چار مضمون لکھے۔ ماہنامہ ''محفل'' نے میرا خاص نمبر شائع کیا جس میں ''تنکے تنکے'' کے عنوان سے اپنی آپ بیتی لکھی۔ محمد خاں کلیم مدیر محفل اور میرے دیرینہ دوست ہیں، ان کے اصرار پر اسے جاری رکھا۔ یوں میری زندگی میں کوئی ایسا معرکہ بھی نہیں کہ جسے ریکارڈ کرنا ضروری ہوتا تاہم اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ قلم اور کاغذ کا رابطہ قائم رہا اور چل رہا ہے۔

مجھے امید نہیں تھی کہ میں اتنی لمبی عمر پاؤں گا اور نہ اتنی عمر کی خواہش تھی۔ میرے والد محترم تہتر سال پورے کرنے سے پہلے پہلے چل بسے۔ میری عمر جوں جوں لمبی ہو رہی ہے، میری تشویش بڑھ رہی ہے۔ لمبی عمر اچھی نہیں ہوتی۔ فی الحال بقدر ضرورت صحت ٹھیک ہے۔ چل پھر لیتا ہوں۔ مالی طور پر بھی کوئی فکر نہیں۔ اولاد خدمت

گزار ہے لیکن ایک بیٹا صغیر الحسن ذہنی مریض ہے اور اس کی طرف سے کبھی کوئی خوشی کی خبر نہیں ملتی۔ جوں جوں رشتوں کا دائرہ وسیع ہو رہا ہے، تفکرات بھی بڑھ رہے ہیں۔ کوئی بیٹا کسی مسئلے کی وجہ سے پریشان ہو تو میں کیسے خوش رہ سکتا ہوں۔

میں نے اپنی والدہ کی لمبی عمر دیکھی ہے۔ ان کے آخری دو سال مکمل معذوری کے عالم میں گزرے۔ ان کی دیکھ بھال کے لیے ایک آدمی کو رات بھر جاگنا پڑتا تھا۔ یہ فریضہ میں اپنے بڑھاپے کی وجہ سے ادا نہ کر سکا اور گنہگار رہا۔ میں نہیں چاہتا کہ عمر کے اس نقطے پر پہنچ کر اپنی اولاد کے لیے امتحان و آزمائش کا باعث ہوں۔

اس لیے میں ہر نماز یہ دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھے چلتے پھرتے اپنی طرف اٹھا لے۔ اس کی طرف سے زندگی بھی نعمت ہے اور موت بھی۔ دعا ہے کہ وہ آخری منزل کو میرے لیے آسان فرمائے۔

پاکستان کے حالات مائل بہ زوال نظر آتے ہیں۔ کرپشن بہت بڑھ گئی ہے۔ حکومت عوام کی تعلیم و تربیت سے غافل ہے۔ مولوی اور استاد بھی ہوس زر میں مبتلا ہو چکے ہیں۔ مدرسوں، مکتبوں، سکولوں اور کالجوں میں استاد 'ڈیڈی کیشن' سے محروم ہو گیا ہے۔ غریب کے لیے سکول کم ہیں اور جو ہیں وہاں کا استاد انہیں پڑھاتا نہیں۔ مولوی باہر سے پیسہ لیتے ہیں اور تعصب کا زہر بچوں کو منتقل کرتے ہیں۔

پاک بھارت جنگ کا بھی خطرہ ہے۔ جس قوم کے زعما ہر قسم کی کرپشن میں مبتلا ہوں۔ ان سے امید نہیں کہ وہ جنگ بھی لڑ سکیں۔ انہیں دنوں ورلڈ کپ کے کوارٹر فائنل میں پاکستان اپنی ناقص منصوبہ بندی کی وجہ سے بھارت سے ہار گیا ہے۔ قوم کے ہر چھوٹے بڑے کو اس کا ملال ہوا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ٹیم کا کپتان وسیم اکرم اس لیے نہ کھیلا کہ اس نے دبئی کے ایک بک کیپر سے ایک کروڑ کی رشوت لی ہوئی تھی۔ ماننے کو جی نہیں چاہتا لیکن نہ ماننے کا بھی کوئی جواز نظر نہیں آتا۔

چوہترویں سال کے آغاز پر مجھے کوئی خاص یا عام خوشی نہیں۔ صرف اتنی خوشی

ہے کہ بیٹوں، بہوؤں، بیٹی، پوتوں، پوتیوں اور دوہتوں، بھائیوں اور بہنوں اور دوستوں سے ملاقات کا موقع ملتا رہے گا اور اس دید و وادید کو میں غنیمت سمجھ کر قبول کرتا ہوں۔ اللہ بہتر جانتا ہے اور بہتر کرے گا۔ آمین! بطفیل چہاردہ معصومینؑ)

اصحاب کہف اور بیلن ٹاریسٹین خاتمہ 1 اگست 1996ء

22 مئی 1996ء

میں ایک خبر کا تراشہ چسپاں کر رہا ہوں۔ اسے پڑھ کر عنوان کی موزونیت کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

مندرجہ بالا خبر پڑھ کر میں نے ایک خط جناب ارشاد احمد حقانی صاحب کے نام لکھا۔

محترمی!

سلام مسنون!

11 مئی 1996ء کے ''جنگ'' کے شمارے میں اداریے سے پہلے صفحے پر ایک خبر شائع ہوئی ہے۔ میں آپ کی توجہ! اس کی عجیب وغریب نوعیت کی طرف دلانا چاہتا ہوں۔ اس کے مستند ہونے کا ذمے دار ''جنگ'' کا فارن ڈیسک ہے اگر یہ خبر سچ ہے تو براہ کرم فارن ڈیسک سے مجھے یہ اطلاع بہم پہنچائیں کہ یہ خبر کس غیر ملکی جریدے میں شائع ہوئی اور اس کی تاریخ اشاعت کیا ہے؟ مجھے معلوم ہے کہ آپ بہت مصروف آدمی ہیں اور آپ کا ایک ایک لمحہ قیمتی ہے لیکن یہ خبر بھی ''قیمتی'' ہے۔ یہ ''اصحاب کہف کے معجزے کی تصدیق کرتی ہے۔''

مخلص

غلام الثقلین نقوی

خود بھی حافظ قرآن ہوں اور اس کے معنی مفہوم جانتے ہوں، تو بہت سے بچے ایسی صلاحیتیں حاصل کر سکتے ہیں۔''

اگر یہ صلاحیتیں اکتسابی ہوتیں، تو محمد حسین کے دوسرے بہن بھائی، ان سے کیوں محروم رہتے؟

یہ بچہ اللہ کی نشانیوں (آیات) میں سے ایک نشانی ہے۔

کل 10 جولائی 1998ء کے رات 9 بجے کے خبرنامے میں ایک نومولود کو ٹیلی ویژن پر دکھایا گیا ہے جو ایک ہسپتال کے Incubator میں ہے۔ اس بچے کا دل اس کے سینے سے باہر ہے۔ اسے دھڑکتا ہوا دکھایا گیا۔ یہ بھی اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔

مجھے اتنی معرفت کہاں حاصل کہ میں بیان کرسکوں کہ اس بچے کی غیر معمول تخلیق میں قدرت کی کون سی حکمت پوشیدہ ہے۔

میں حیرت کے سوا اور کس ردعمل کا اظہار کرسکتا ہوں۔

فاعیہ ویا اولی الابصار



12 مئی 1996ء

اس خط کے جواب میں ارشاد احمد حقانی صاحب نے مجھے اس خبر کا تراشہ بھجوا دیا جو انگریزی اخبار میں چھپی تھی۔ یہ تراشہ نیچے چسپاں ہے۔ میں ان کا بہت شکر گزار ہوں۔

یہ خبر ویکلی ورلڈ نیوز مورخہ 7 مئی 1996ء کے سپیشل ایڈیشن میں چھپی تھی۔ اس کا ترجمہ درج ذیل ہے۔

فلاڈیلفیا پی۔ اے..........ہیلن ٹاریسٹین آج سے پینتیس سال پہلے ایک حادثے کی وجہ سے کومے میں چلی گئی تھی..........اور 1961ء سے اب تک اس کی عمر میں ایک دن کا بھی اضافہ نہیں ہوا۔

20 فروری کو جب دو بچوں کی ماں معجزاتی طور پر بیدار ہوئی تو اس کی عمر 67 سال تھی لیکن وہ اتنی کم عمر نظر آتی تھی جیسے اپنے ہی بیٹے کی اولاد ہو۔

ہیلن کے خاوند کارل نے بتایا ''ڈاکٹر کہتے ہیں کہ ہم نے آج تک کوئی ایسا کیس نہیں دیکھا کہ کومے میں گئے ہوئے کسی شخص کی عمر میں اضافہ رک گیا ہو۔ عام طور پر ذہنی لحاظ سے وقت ان کے لیے ساکن ہو جاتا ہے لیکن ان کا جسمانی عمل جاری رہتا ہے۔ ہیلن کے کیس میں کسی وجہ سے سب کچھ رک گیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اس کا حیاتیاتی عمل پینتیس سال کے لیے معطل ہو گیا ہو۔''

گندمی رنگ اور بھورے بالوں والی یہ خوبصورت ماں کہ جس کا وجود ایک معجزہ ہے، کہتی ہے کہ اسے اس خوفناک لمحے کے بعد کی کوئی بات یاد نہیں جب وہ اپنے گھر کے سامنے کے پورچ پر سفیدی کرتے ہوئے سیڑھی سے گر پڑی تھی اور اس کا سر کنکریٹ کے فٹ پاتھ سے جا ٹکرایا تھا۔ اس خاتون کو کہ جس کی عمر اس وقت بتیس (32) سال تھی، سر کی شدید ضربوں کے علاج کے لیے ایک ہسپتال میں داخل کرایا گیا لیکن چار مہینوں کے علاج کے بعد بھی ہوش نہ آیا تو اسے ایک نرسنگ ہوم میں منتقل کر دیا

گیا۔

کارل نے اپنی یادوں کو کریدتے ہوئے کہا ''جب یہ حادثہ پیش آیا، میرے بیٹے چپ کی عمر پندرہ برس تھی اور تھیلما صرف آٹھ سال کی تھی۔ ہیلن مکمل طور پر بے ہوش تھی۔ آنکھ حرکت سے محروم اور بیداری کی دیگر کوئی علامت نظر نہ آتی تھی۔ چپ اور تھیلا نرسنگ ہوم میں جاتے اور ہیلن کے پلنگ کے پاس کھڑے ہو کر آنسو بہاتے لیکن وہ کسی ردعمل کا اظہار نہ کرتی۔ کچھ سالوں کے بعد ہم اس کے شفایاب ہونے سے مایوس ہوگئے اور اپنے روزانہ کے معمولات میں مشغول ہوگئے۔ ہفتہ دو ہفتہ بعد ہم اسے دیکھنے جاتے لیکن یہ ملاقاتیں بے سود ہی ثابت ہوتیں۔ اس کی طرف سے پہچان کا ذرہ بھر اظہار نہ ہوتا۔''

جوں جوں سال گزرتے گئے ڈاکٹر اور ہیلن کے گھر کے لوگ محسوس کرنے لگے کہ اس بے ہوش خاتون کی جسمانی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں آرہی۔ وہ نرسنگ ہوم کے پلنگ پر بے حس و حرکت لیٹی ہوئی تھی اور ماہ و سال کے گزرنے کا اس پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔

اس کے بچے جوان ہوگئے۔ دونوں گریجوایٹ ہوئے، شادیاں کیں اور اب وہ بال بچوں والے تھے لیکن اس اثنا میں ہیلن کے جسم نے کسی تغیر کو قبول نہ کیا تھا۔ اس کے پیار کرنے والے خاوند کی توند نکل آئی اور بال سفید ہوگئے لیکن ہیلن کے حسن و شباب میں کوئی فرق نہ آیا۔

''تب ایک رات جب نرس بستر کی چادریں تبدیل کر رہی تھی، وہ اچانک بیدار ہوگئی۔'' کارل نے کہا ''مجھے نرسنگ ہوم سے فون آیا اور میں فوراً وہاں پہنچا.......... ہیلن ہوش میں آچکی تھی اور مکمل نارمل معلوم ہو رہی تھی لیکن اسے قطعاً یاد نہیں آرہا تھا کہ میں کون ہوں۔ ڈاکٹر یہ عقدہ حل کرنے سے معذور ہیں کہ وہ اچانک کیسے ہوش میں آگئی۔''

اس معجزاتی بیداری کے بعد چند دنوں کے اندر اندر کو مام (ہیلن) کو احساس ہوگیا کہ وہ اپنی زندگی کے پینتیس 35) سال کھو چکی ہے اور یہ کہ ستر سالہ کارل اس کا شوہر ہے۔ وہ اپنے بچوں سے ملی جو اب پچاس اور پینتیس سال کے ہیں......... اور اپنے چار پوتے پوتیوں سے بھی اس کی پہلی بار ملاقات ہوئی۔

ایک ہفتہ بعد ڈاکٹروں نے ہیلن کو ہسپتال سے فارغ کر دیا اور اب یہ چھریرے بدن کی سابقہ مریضہ پھر اپنے گھر میں اپنے خاندان والوں کے ہاں آ گئی ہے۔

ہیلن کہتی ہے ''مجھے نئی زندگی سے مطابق پیدا کرنے کے لیے بہت کچھ کرنا پڑے گا۔''

وہ اگلا سال اپنے گھر والوں سے دوبارہ آشنا اور مانوس ہونے میں صرف کرنا چاہتی ہے۔ ''بیماری میں کٹ جانے والے پینتیس سالوں میں دنیا جن حالات و واقعات سے گزری ہے، مجھے ان کا علم حاصل کرنا ہے۔ بعض اوقات یہ سوچ کر بہت غمگین ہوجاتی ہوں کہ میں اپنے بچوں کو نشوونما پاتے ہوئے نہ دیکھ سکی یہ میرے ڈاکٹر کہتے ہیں کہ میری ابھی بہت زندگی باقی ہے۔ اس لیے مجھے امید ہے کہ مستقبل میں کھوئے ہوئے سالوں کی تلافی کرسکوں گی۔''

11 مئی 1996ء کے جنگ کے شمارے میں جو مختصر سی خبر شائع ہوئی تھی، اسے بہت کم لوگوں نے پڑھا ہوگا۔ یہ خبر ایک ایسے صفحے پر چھپی تھی جس کا بیشتر حصہ ضمیمے کے طور پر صرف ہوا تھا۔ مجھے اداریے والے صفحے کی تلاش تھی اور یہ صفحہ اس صفحے کی پشت پر تھا۔

ممکن ہے کہ کچھ لوگوں نے اس اس خبر کو پڑھا ہو لیکن شاید ہی کوئی شخص ہوگا جس کا ذہن اس خبر سے اصحاب کہف کی طرف منتقل ہوا ہو۔

میں نے چند روز قبل مولانا مودودی کی تفسیر میں اس قصے کی تفصیل غالبًا

دوبارہ یا سہ بارہ پڑھی تھی اور اس کا موازنہ و مقابلہ مولانا ابوالکلام آزاد کی تفسیر سے کرتا رہا تھا۔ مولانا آزاد کی تفسیر اس قصے کی حد تک میں نے پہلے بھی پڑھی ہوئی تھی۔

چنانچہ میرے ذہن کا دریچہ اچانک وا ہو گیا۔

مجھے ہیلن کے پینتس سالہ کومے اور اصحاب کہف کی صدیوں کی نیند میں اتنی مماثلت نظر آئی بلکہ محسوس ہوئی کہ میرے کانوں میں ایک آواز گونج اٹھی:

"(اے پیغمبر!) کیا تو خیال کرتا ہے کہ غار اور رقیم والے ہماری نشانیوں میں سے کوئی عجیب نشانی تھے؟

جب ایسا ہوا تھا کہ چند نوجوان غار میں جا بیٹھے تھے اور انہوں نے دعا کی تھی "پروردگار! تیرے حضور سے ہم پر رحمت ہو اور تو ہمارے اس کام کے لیے کامیابی کا سامان مہیا کر دے۔"

پس غار میں کئی برس تک ان کے کان دنیا کی طرف سے بند رکھے۔ پھر انہیں اٹھا کھڑا کیا تاکہ واضح ہو جائے، دونوں جماعتوں میں سے کون ہے، جو گزری ہوئی مدت کا زیادہ بہتر طریقے پر احاطہ کر سکتا ہے۔"

(ترجمان القرآن از مولانا ابوالکلام آزاد مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز، صفحہ 408)

اگر یہ خبر سچ ہے تو اس سے "اصحاب کہف" کے قصے کی پوری پوری تصدیق ہوتی ہے.......... ایک لمبی نیند کی بھی اور اس سے اچانک بیدار ہونے کی بھی..........

جس طرح پینتیس سال ہیلن کی زندگی سے خارج ہو گئے تھے، اسی طرح صدیاں اصحاب کہف کی زندگی سے منہا ہو گئی تھیں۔ ہیلن پر جب لمبی نیند طاری ہوئی تھی، وہ پینتیس (35) سال کی تھی اور جب وہ جاگی تھی تو بھی پینتیس سال کی تھی اور اصحاب کہف جب سوئے تھے تو جوان تھے اور جب جاگے تھے تو بھی جوان تھے۔

ہیلن شاید آنے والی زندگی سے اپنے آپ کو ایڈجسٹ کر لے اور اپنے سے زیادہ عمر کے بیٹے اور بیٹی سے بھی جذباتی مفاہمت کر لے اور اپنے ستر سالہ خاوند کو بھی

قبول کرلے لیکن ''اصحاب کہف'' کا بدلے ہوئے زمانے سے مطابق اختیار کرنا ان کے لیے شاید ناممکن تھا یا زیادہ صحیح یہ ہے کہ وہ اپنی زندگی کا مشن پورا کر چکے تھے، اس لیے ان پر پھر نیند طاری کر دی گئی اور اب اس نیند سے وہ صورِ اسرافیل کی بانگ سن کر ہی جاگیں گے۔

مضمون یہاں ختم ہوسکتا تھا۔

لیکن قلم نے سرتابی کی اور وہ اپنے آپ آگے بڑھ گیا۔ اشہبِ قلم بھی کبھی کبھار منہ زوری دکھاتا ہے۔ اصل میں اسے قصے اور خبر دونوں میں موازنہ و مقابلہ کے کچھ ایسے نادر و نایاب نکات دکھائی دے گئے تھے کہ ان سے صرف نظر اسے گوارا نہ ہوا۔

ڈاکٹر حیران ہیں کہ ہیلن کومے سے اچانک کیسے نکلی اور اس کی عمر ایک نقطے پر کیسے ٹھہر گئی حالانکہ زماں و مکاں کی گردش جاری رہی۔ ممکن ہے کہ ڈاکٹروں کو کبھی اس مسئلے کا حل مل جائے۔

میرا ناقص خیال ہے کہ جس نرسنگ ہوم میں وہ رہی، اس کی فضا اور آب و ہوا (ٹمپریچر وغیرہ) کو اس طرح کنٹرول کیا گیا کہ ان کا کم سے کم اثر اس کے جسم پر پڑے اور جسم شکست و ریخت (Wear And Tear) سے محفوظ رہے۔ اسے جو غذا دی جاتی رہی ہوگی، وہ نہایت لطیف و منزہ ہوگی کہ معدے پر بوجھ نہ ڈالے اور بدن کو معمر ہونے سے بچائے۔ امریکہ کے ہسپتالوں اور نرسنگ ہوموں کا وہ حال تو نہیں جو پاکستان کے ہسپتالوں اور نرسنگ ہوموں کا ہے کہ یہاں ایک دن کا بچہ پینتیس (35) سال کے بعد ایک سو پینتیس سال کا بوڑھا بن جائے۔

بڑا امکان ہے کہ اس نرسنگ ہوم میں ''شانگری لا'' والی فضا قائم کر دی گئی ہو کہ جہاں عمر کی رفتار اتنی دھیمی ہوجاتی ہے کہ ایک اٹھارہ سال کی گڑیا سی مانچو شہزادی ساٹھ سال کی عمر میں بھی انیس بیس سال سے زیادہ کی نہیں لگتی۔ دیکھئے جیمز ہلٹن کا ناول لاسٹ ہورائزن (Lost Horizon)۔

''اصحاب کہف'' کو بھی قدرت نے ایک ایسا ہی غار مہیا کیا تھا کہ جس کی فضا خوشگوار اور آلائش سے پاک تھی۔ نہ گرم، نہ سرد اتنی معتدل کہ جسم ٹوٹ پھوٹ کا شکار نہ ہوں۔

سورہ الکہف کی آیت نمبر 17 کے ایک حصے کا ترجمہ درج ذیل ہے:

> ''اور وہ جس غار میں جا کر بیٹھے، وہ اس طرح واقع ہوئی ہے کہ سورج نکلے تو تم دیکھو کہ ان کے داہنے جانب سے ہٹا ہوا ہوتا ہے اور جب ڈوبے تو بائیں طرف کترا کر نکل جاتا ہے (یعنی کسی حال میں بھی ان کی شعاعیں اندر نہیں پہنچتیں) اور وہ اس کے اندر ایک کشادہ جگہ میں پڑے ہیں۔ یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے............''

(ترجمان القرآن از مولانا ابوالکلام آزاد صفحہ 409)

مولانا آزاد اپنے مفصل تشریحی نوٹ میں فرماتے ہیں۔ ''جس غار میں انہوں نے پناہ لی، وہ اس طرح کی واقع ہوئی ہے کہ اگرچہ اندر سے کشادہ ہے اور دہانہ کھلا ہوا ہے لیکن سورج کی کرنیں اس میں راہ نہیں پاسکتیں، نہ تو چڑھتے دن میں، نہ ڈھلتے دن میں جب سورج نکلتا ہے تو داہنی جانب رہتے ہوئے گزر جاتا ہے۔ جب ڈھلتا ہے تو بائیں جانب رہتے ہوئے غروب ہو جاتا ہے یعنی غار اپنے طور میں شمال و جنوب رویہ واقع ہے۔ ایک طرف دہانہ ہے، دوسری طرف مَنفَذ۔ روشنی اور ہوا دونوں طرف سے آتی ہیں لیکن دھوپ کسی طرف سے بھی راہ نہیں پاسکتی۔''

(ترجمان القرآن ص۔ 462)

''مَنفَذ'' کے معنی ہیں گزرنے کی جگہ یعنی روزن۔ گویا اس غار میں قدرت نے کراس وینٹی لیشن (Cross Ventilation) کا انتظام کیا ہوا تھا۔ مولانا آزاد کے نزدیک زندہ رہنے کے لیے وہ نہایت محفوظ و موزوں مقام ہے کیونکہ ہوا اور روشنی کی

راہ موجود ہے مگر دھوپ کی تپش اندر نہیں پہنچ سکتی۔ پھر اندر سے کشادہ ہے جگہ کی کمی نہیں۔

یہ معجزہ ایک ایسا ے ملک میں رونما ہوا جہاں گرمی اور تپش انسان کو جلد بوڑھا کر دیتی ہیں۔ یہی معجزہ اگر کسی سرد یا برفانی ملک میں رونما ہوتا تو شاید اس غار میں قدرت روشنی کے ساتھ حدت کو بھی داخل ہونے کی اجازت مرحمت فرماتی تاکہ اعتدال کی موزوں فضا قائم ہو سکے۔

قدرت نے اس غار کو ہوا بند بھی نہیں کیا یعنی ایر کنڈیشنڈ کیونکہ ہوا بندی کی فضا میں آکسیجن کم سے کم تر ہوتی چلی جاتی ہے۔

سورۃ الکھف سے مجھے دو نکتے اور ملے ہیں جن کی ''ندرت'' تقاضا کرتی ہے کہ انہیں بیان ضرور کیا جائے۔

1. ''اور تم انہیں دیکھو تو یہ خیال کرو یہ جاگ رہے ہیں حالانکہ وہ سو رہے ہیں۔ ہم انہیں دائیں بائیں پلٹتے رہتے ہیں (یعنی ان کی کروٹ بدلتی رہتی ہے۔) (الکھف آیت نمبر 18۔ ترجمان القرآن از مولانا ابوالکلام آزاد صفحہ 410)

مولانا سید مودودی اس کا ترجمہ یوں فرماتے ہیں:

''اور تم انہیں دیکھ کر یہ کہتے کہ وہ جاگ رہے ہیں۔ ہم انہیں دائیں بائیں کروٹ دلواتے رہتے ہیں............''

تفہیم القرآن صفحہ 15

سبھی مفسرین (جنہیں میں نے پڑھا ہے۔) دائیں بائیں کروٹ بدلنے کی توجیہہ یہ کرتے ہیں کہ وہ باہر سے دیکھنے والوں کو بیدار نظر آئیں لیکن مولانا آزاد اس سے اختلاف کرتے ہیں ''لیکن یہ توجیہہ پہلے سے بھی زیادہ بے معنی ہے۔ اول تو کروٹ بدلنا بیداری کی دلیل نہیں۔ آدمی گہری سے گہری نیند میں ہوتا ہے اور کروٹ بدلتا ہے۔ ثانیاً اگر کروٹ بدلتے ہوں گے تو کچھ

وقفہ کے بعد بدلتے ہوں گے............''

(ترجمان القرآن صفحہ 427)

لیکن صفحہ 430 پر وہ ''کروٹ بدلنے'' کی جو تفسیر لکھتے ہیں، وہ عجیب و غریب نوعیت کی ضرور ہے لیکن منطق پر پوری نہیں اترتی۔ فرماتے ہیں ''غار شمال و جنوب رویہ واقع تھا اور ان دونوں جہتوں میں ہوا اور روشنی کے منافذ تھے جیسا کہ آیت 'وتری الشّمس اذا طلعت' سے متبادر ہوتا ہے۔ پس بالمقابل منافذ ہونے کی وجہ سے ہوا برابر اندر چلتی رہتی تھی اور ان کے ڈھانچے دہنے سے بائیں اور بائیں سے دہنی جانب اس طرح متحرک رہتے تھے جیسے ایک زندہ آدمی ایک طرف سے پلٹ کر دوسری طرف دیکھے۔''

جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں مولانا کے نزدیک یہ حالت اصحاب کہف کے دوسرے دور کی ہے جب وہ راہبانہ زندگی اختیار کر کے غار میں معتکف ہو گئے تھے حتیٰ کہ وفات پا گئے۔

بہرحال یہ کیسے ممکن ہے کہ ہوا کے جھونکوں سے اصحاب کہف کے ڈھانچے متحرک رہتے ہوں۔ یقیناً وہ کھونٹوں سے ٹنگے ہوئے تو نہیں تھے اور نہ رسوں سے جھول رہے تھے (نعوذ باللہ)۔ وہ غار کے فرش پر لیٹے ہوں گے یا رکوع و سجود کی حالت میں ہوں گے۔

مولانا مودودی کی آیت کے اس حصے کو اصحاب کہف کی پہلی حالت سے مرتبط جانتے ہیں۔ تفہیم القرآن جلد سوم کے صفحہ نمبر 15 پر نوٹ نمبر 14 میں لکھا ہے:

''یعنی اگر کوئی باہر سے جھانک کر دیکھتا بھی تو ان سات آدمیوں کے وقتاً فوقتاً کروٹیں لیتے رہنے کی وجہ سے وہ یہی گمان کرتا کہ یہ بس یونہیں لیٹے ہوئے ہیں، سوئے ہوئے نہیں۔''

مجھ جیسے بے علم شخص کو کہ جسے چوہتر سال کی عمر میں بھی عـربـی نہیں آتی اور جس نے قرآن صرف ترجمے کی حد تک پڑھا ہے، کوئی حق حاصل نہیں کہ ان عظیم مفسرین سے ایک قدم آگے بڑھنے کی جسارت کرے۔

لیکن ہیلن کی پینتیس سالہ نیند کا اصحاب کہف کی صدیوں کی نیند سے مقابلہ و موازنہ کرتے ہوئے مجھے نظر آتا ہے کہ قدرت نے جس غار کو ان کے لیے نرسنگ ہوم قرار دیا تھا اور جس میں ایسے حالات پیدا کیے تھے کہ ان کے اجسام شکست و ریخت ہے محفوظ رہیں۔ وہاں اس نے چند کارکنان قضا و قدر کو اس ڈیوٹی پر بھی مامور کر دیا ہوگا کہ ان کی کروٹ بدلتے رہیں تاکہ یہ مقدس اجسام بستر کی لاگ (Bed Sore) سے محفوظ رہیں، خون کی گردش بھی جاری رہے اور دل وجگر کا فعل بیدار۔

2. دوسرا نادر نکتہ مجھے سورہ الکہف دسویں آیت ''فَضَرَبْنَا عَلٰى آذَانِهِمْ فِي الْكَهْفِ سِنِيْنَ عَدَدًا'' میں نظر آیا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے:

''پس غار میں کئی برسوں تک ہم نے ان کے کان (دنیا کی طرف سے) بند کر رکھے۔''

(ترجمان القرآن ص408)

مولانا سید مودودی کا ترجمہ درج ذیل ہے:

''ہم نے انہیں اسی غار میں تھپک کر سالہا سال کے لیے گہری نیند سلا دیا۔''

(تفہیم القرآن جلد سوم صفحہ 13)

مولانا مودودی کا ترجمہ بامحاورہ ہے لیکن مولانا آزاد کا ترجمہ میرے ناقص خیال میں متن سے قریب تر ہے۔

گہری نیند کے لیے ضروری ہے کہ کان دنیا کی طرف سے بند ہوں۔ جب تک شوروغل کان میں درآتا رہے گا، گہری نیند کیسے آسکتی ہے۔

مولانا آزاد اپنے تشریحی نوٹ میں لکھتے ہیں" .... ان کے کان دنیا کی طرف سے بند ہوگئے تھے یعنی دنیا کی کوئی صدا ان کے کانوں تک نہیں پہنچتی تھی.........."

(ترجمان القرآن صفحہ 427)

آج کل ماحول کی آلودگی نے انسان کو بہت پریشانی میں مبتلا کیا ہوا ہے۔ جدید تحقیق کے مطابق ماحول کی آلودگی میں شوروغل کو بہت دخل ہے۔ شوروغل سے نہ صرف اعصاب متاثر ہوتے ہیں بلکہ جسم و ذہن ٹوٹ پھوٹ کا شکار بھی ہوتے ہیں۔ یہ ایک ایسا زہر ہے جو کانوں کے راستے داخل ہوکر جسم کو گھلاتا رہتا ہے۔

جو لوگ شہر کی کسی بڑی سڑک کے کنارے مکان یا فلیٹ میں رہتے ہیں یا جنہیں ٹریفک کے شور میں مسلسل کئی کئی گھنٹے بسر کرنا ہوتے ہیں، یہ شور ان کے رگ و ریشے میں رَچ بس کر ان کے معمول کا حصہ بن جاتا ہے لیکن دن رات کے کسی حصے میں یہ شور اچانک تھمتا ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ایک بوجھ آناً فاناً ان کے جسم پر سے اتر گیا ہو اور وہ ہلکے پھلکے ہوگئے ہوں۔ جب میں ملتان روڈ سے متصل اور متوازی پونچھ ہاؤس کالونی کے ایک کوارٹر میں رہا کرتا تھا تو اکثر اس کیفیت سے گزرتا تھا۔

ایک بار اسلام آباد میں فیصل مسجد کے بالمقابل ایک سڑک کے کنارے بیٹھے بیٹھے یوں لگا جیسے میں ہلکا پھلکا ہوکر آسمان کی طرف اڑنے لگا ہوں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس سڑک پر ٹریفک نہیں تھی اور مجھ سے کچھ دور جو بسیں اور ویگنیں چل رہی تھیں، ان کی حرکت سے شور مہنا ہو چکا تھا۔

اس لیے میرا ناقص خیال یہ ہے کہ ان کے اجسام کو صدیوں تک تروتازہ رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ ان کے نرسنگ ہوم کو صدا بند(Sound Proof) بنا دیا جائے

کہ طوطی وبلبل کی نغمہ سرائی بھی ان کی نیند میں خلل انداز ہوتی اور ان کے اجسام بوسیدہ ہوتے چلے جاتے۔

یقیناً ہیلن کے نرسنگ ہوم میں بھی صدا بندی کا انتظام ہوگا۔

ہیلن والی خبر اور اصحاب کہف کے واقعے میں مماثلت کے جو نکات مجھے نظر آئے، وہ میں نے بیان کر دیے ہیں۔

ہیلن والی خبر وضعی بھی ثابت ہوسکتی ہے۔ اخباری رپورٹر سنسنی پیدا کرنے کے لیے اختراع وایجاد سے بھی گریز نہیں کرتے اور لوگ بھی اخبار میں چھپنے کے لیے عجیب عجیب قصے گھڑ لیتے ہیں۔

لیکن اس سے اصحاب کہف والے معجزے کی حقانیت میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ جہاں تک معجزات پر ایمان کا تعلق ہے، میرا عقیدہ ہے کہ انہیں منطق کی کسوٹی پر پرکھنا ایک قسم کی ایمانی کمزوری ہے۔ معجزہ علت ومعلول کی قید سے آزاد ایک لاثانی مظہر (Unique Phenomenon) ہوتا ہے۔ اسے استثنائی صورت بھی کہہ سکتے ہیں اور استثنا قانون کو ثابت کرتی ہے یعنی فطرت کبھی کبھار کسی خاص مقصد کے لیے اپنے قانون کو معطل کر دیتی ہے۔

مجھے قرآن پاک کی تلاوت کا لڑکپن سے شوق ہے۔ شروع میں نہ ترجمے کا ذوق تھا، نہ تفسیر میں کوئی دلچسپی۔

جوانی میں کچھ ترقی پسندی ذہن پر حاوی ہوگئی اور صبح کی نماز اور تلاوت میں ناغے ہونے لگے۔ یہ تذبذب اور بے یقینی کا زمانہ تھا۔ ستائیس سال کی عمر میں جب ایم۔ اے (اردو) کی تیاری کر رہا تھا۔ میں نے سرسید کی تفسیر کے کچھ اقتباسات پڑھے۔ انہوں نے معجزات کی جو عقلی تاویلیں کیں، وہ مجھے قطعی متاثر نہ کرسکیں۔ صرف بحر قلزم میں جوار بھاٹے والی تاویل میں کچھ منطق نظر آئی لیکن یہ بات سمجھ میں نہ آئی کہ پانی کی دو دیواروں کے درمیان درّہ کیسے بن گیا اور حضرت موسیٰؑ اور ان کی قوم سوکھے

درے میں سے گزر گئی اور فرعون اور اس کی فوج درے میں داخل ہوئی تو دیواریں مل گئیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی نامکمل تفسیر کے کچھ اقتباسات کتابی صورت میں شائع ہوئے، تو ایک کتاب میرے ہاتھ بھی لگ گئی۔ مجھے یاد ہے کہ ایک ہی نشت میں پڑھ ڈالی۔ اس میں غالباً اصحاب کہف، موسیٰ وخضرؑ اور حضرت ذوالقرنین کے تین قرآنی قصوں کی تشریح وتفسیر کو مسلسل اور مربوط کر دیا گیا تھا۔ انہیں پڑھ کر بہت لطف آیا بلکہ یوں کیوں کہ میں کتاب میں گم ہوگیا اور کتاب مجھ میں جذب ہوگئی۔ اس میں غالب دخل مولانا ابوالکلام آزاد کی سحر طراز طرز تحریر کو تھا۔ حضرت ذوالقرنین کی داستان کو جس انداز میں مولانا نے دیکھا ہے اور پرکھا ہے، اس کا جواب نہیں۔ البتہ اصحاب کہف اور موسیٰؑ وخضرؑ کے قصوں میں ''ابہام'' کی جو فضا ہے، اسے مولانا کی تعقل پسندی واضح نہیں کر سکی۔

آج ان کی پوری تفسیر میرے زیر مطالعہ ہے اور اس مضمون میں نے اس سے بہت فائدہ اٹھایا ہے لیکن محسوس یہی ہوا ہے کہ مولانا نے سیدھے سادھے قصے کو الجھا دیا ہے۔

البتہ مولانا مودودی نے قصے کو سلجھانے کی سعی کی ہے اور اس میں کامیاب رہے ہیں۔ تفہیم القرآن جلد سوم کے صفحات 769 تا 771 کے ضمیمہ نمبر 1 کے مطالعے سے ہر پڑھنے والے کو مستفیض کرنے کے لیے میں اسے یہاں نقل کرتا ہوں۔

''شہر افسوس'' (EPHESUS) جس میں اصحاب کہف کا واقعہ پیش آیا، تقریباً گیارھویں صدی قبل مسیحؑ میں تعمیر ہوا تھا اور بعد میں یہ بت پرستی کا بہت بڑا مرکز بن گیا۔ یہاں چاند دیوی کی پوجا ہوتی تھی جسے ڈائنا کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ اس کا عظیم الشان مندر عہد قدیم کے عجائبات عالم میں شمار کیا جاتا ہے۔ ایشیائے کوچک کے لوگ اس کی پرستش کرتے تھے اور رومی سلطنت نے بھی اس کو معبدوں میں شامل کر لیا

تھا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد جب مسیحی دعوت رومی سلطنت کے مختلف علاقوں میں پہنچنا شروع ہوئی تو اس شہر کے چند لوگ بھی شرک سے تائب ہو کر خدائے واحد پر ایمان لے آئے۔ ان کے قصے کے جو تفصیلات مسیحی روایات کو جمع کر کے گریگوری آف ٹورس(Gregory of Tours) نے اپنی کتاب (Lbier Meraculorum) میں بیان کی ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے:

یہ سات نوجوان تھے۔ ان کی تبدیلی مذہب کا حال سن کر قیصر ڈیسی اُس (Decius۔ دقیانوس) نے ان کو اپنے سامنے طلب کیا اور ان سے پوچھا کہ تمہارا مذہب کیا ہے۔ انہیں معلوم تھا کہ قیصر پیروان مسیحؑ کے خون کا پیاسا ہے مگر انہوں نے کسی خوف کے بغیر صاف صاف کہہ دیا کہ ہمارا رب وہ ہے جو زمین و آسماں کا رب ہے۔ اس کے سوا ہم کسی اور معبود کو نہیں پکارتے۔ اگر ہم ایسا کریں تو بہت بڑا گناہ کریں گے۔ قیصر نے پہلے تو سخت مشتعل ہو کر کہا کہ اپنی زبان بند کرو ورنہ میں تمہیں ابھی قتل کروا دوں گا۔ پھر کچھ ٹھنڈا ہوا اور بولا تم ابھی بچے ہو۔ میں تمہیں تین دن دیتا ہوں۔ اس مدت میں اگر تم نے اپنا رویہ بدل لیا اور اپنی قوم کے مذہب کی طرف پلٹ آئے تو خیر ورنہ تمہاری گردن ماردی جائے گی۔

اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر یہ ساتوں نوجوان شہر سے بھاگ نکلے اور انہوں نے پہاڑوں کی راہ لی تا کہ کسی غار میں جا چھپیں۔ راستے میں ایک کتا ان کے ساتھ لگ گیا۔ انہوں نے بہتیری کوشش کی کہ وہ ان کا پیچھا چھوڑ دے مگر وہ کسی طرح ان سے الگ نہ ہوا۔ آخر کار ایک بڑے گہرے غار کو اچھی جائے پناہ دیکھ کر وہ اس میں چھپ گئے اور کتا اس کے دہانے پر بیٹھ گیا۔ تھکے ماندے تھے، اس لیے فوراً ہی سو گئے۔ یہ 250 عیسوی کا واقعہ ہے۔ 197 برس بعد 447 عیسوی میں وہ یکا یک بیدار ہوئے جب قیصر تھیوڈوسیس اُس(Theodosius) دوم کا عہد حکومت تھا۔ رومی سلطنت

مسیحیت اختیار کر چکی تھی اور شہر افسوس کے باشندے بھی بت پرستی ترک کر چکے تھے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب رومی باشندوں کے درمیان زندگی بعد موت اور حشر ونشر کے معاملے میں سخت اختلاف برپا تھا اور قیصر اس بات پر بہت فکر مند تھا کہ لوگوں کے دلوں سے انکار آخرت کا خیال کیسے نکالا جائے۔ ایک روز اس نے خدا سے دعا کی وہ کوئی ایسی نشانی دکھا دے جس سے لوگ آخرت پر ایمان لے آئیں۔ اتفاق کی بات ہے کہ ٹھیک اسی زمانے میں یہ نوجوان جاگ اٹھے۔

بیدار ہو کر انہوں نے آپس میں پوچھا کہ کتنی دیر ہم سوئے ہوں گے، کسی نے کہا دن بھر، کسی نے کہا دن کا کچھ حصہ۔ پھر یہ کہہ کر سب خاموش ہو گئے کہ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے ایک ساتھی جین(Jean) کو چاندی کے چند سکے دے کر کھانا لانے کے لیے شہر بھیجا اور اس سے کہا کہ ذرا احتیاط سے کام لینا، کہیں لوگ تمہیں پہچان نہ جائیں۔ انہیں ڈر تھا کہ اگر لوگوں کو ہمارا پتہ چل گیا تو وہ ہمیں پکڑ لے جائیں گے اور ڈائنا کی پرستش پر مجبور کریں گے۔

مگر جین جب شہر پہنچا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ دنیا بدل ہوئی ہے، سب لوگ مسیحی ہو گئے ہیں اور ڈائنا کو پوجنے والا کوئی باقی نہیں رہا۔ ایک دکان پر پہنچ کر اس نے کچھ روٹیاں خریدیں اور دکاندار کو چاندی کا ایک سکہ دیا جس پر قیصر ڈیسی اس کی تصویر تھی۔ دکاندار یہ سکہ دیکھ کر حیران ہو گیا۔ اس نے پوچھا یہ تمہیں کہاں سے ملا۔ جین نے کہا یہ میرا اپنا مال ہے، کہیں سے لایا نہیں ہوں۔ اس پر دونوں میں تکرار ہونے لگی۔ لوگ جمع ہو گئے حتیٰ کہ کوتوال شہر تک معاملہ پہنچا۔ کوتوال نے کہا مجھے وہ دفینہ بتاؤ جہاں سے تم یہ سکہ لائے ہو۔ جین نے جواب دیا دفینہ کیسا؟ یہ میرا اپنا مال ہے، میں کسی دفینے کو نہیں جانتا۔

کوتوال نے کہا تمہاری یہ بات ماننے کے قابل نہیں۔ یہ صدیوں پرانا سکہ ہے، تم تو ابھی جوان لڑکے ہو۔ ہمارے بڑے بوڑھوں نے بھی کبھی یہ سکہ نہیں دیکھا۔ یہ

ضرور کوئی راز ہے۔

جین نے جب یہ سنا کہ قیصر ڈیسی اس کو مرے زمانہ دراز گزر چکا ہے تو وہ دنگ رہ گیا اور کچھ دیر تک بالکل دم بخود رہا۔ پھر آہستہ سے بولا کل ہی تو میں اور میرے چھ ساتھی اس شہر سے بھاگ کر گئے تھے اور ایک غار میں ہم نے پناہ لی تھی تا کہ ڈیسی اس کے ظلم سے بچے رہیں۔ جین کی یہ بات سن کر کوتوال بھی حیران ہو گیا اور وہ اس کو لے کر اس غار کی طرف چلا جہاں اس کے بیان کے مطابق یہ لوگ چھپے ہوئے تھے۔ لوگوں کا ایک انبوہ کثیر ان کے ساتھ تھا۔ وہاں پہنچ کر یہ امر پوری طرح تحقیق ہو گیا کہ یہ واقعی قیصر ڈیسی اُس کے زمانے کے لوگ ہیں۔

قیصر تھیوڈیسی اُس کو اس کی اطلاع دی گئی۔ وہ خود آ کر ان سے ملا اور برکت لی۔

اس کے بعد یہ ساتوں آدمی غار میں جا کر لیٹے اور وفات پا گئے۔

اس صریح نشانی کو دیکھ کر لوگ مان گئے کہ واقعی زندگی بعد موت برحق ہے۔

پھر قیصر کے حکم سے اس غار پر ایک زیارت گاہ تعمیر کر دی گئی۔"

مولانا آزاد اس واقعے کو ایک قدیم یونانی شہر بطرا (PETRA) سے منسوب کرتے ہیں لیکن مولانا سید مودودی نے مندرجہ بالا مسیحی روایت کی بنا پر اسے شہر افسوس سے وابستہ جانا ہے۔

دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ ان کے غار پر زیارت گاہ تعمیر کی گئی تھی۔

مولانا آزاد لکھتے ہیں "......... ازاں جملہ اس علاقہ کے عجیب و غریب غار ہیں جو دور دور تک چلے گئے ہیں اور نہایت وسیع ہیں۔ نیز اپنی نوعیت میں ایسے واقع ہوئے ہیں کہ دن کی روشنی کسی طرح بھی ان کے اندر نہیں پہنچ سکتی۔ ایک غار ایسا بھی ہے جس کے دہانے پر قدیم عمارتوں کے آثار پائے جاتے ہیں اور بے شمار ستونوں کی کرسیاں شناخت کی گئی ہیں۔ خیال کیا گیا ہے کہ یہ کوئی معبد ہو گا جو یہاں تعمیر کیا گیا

تھا۔"

(ترجمان القرآن صفحہ 425)

مولانا مودودی تحریر فرماتے ہیں:

"اس موقع پر یہ ذکر کر دینا بھی خالی از فائدہ نہیں کہ 1834ء میں ریورنڈ ٹی اورنڈیل(Arundell) نے ایشائے کوچک کے اکتشافات(Discoveries In Asia Minor) کے نام سے اپنے جو مشاہدات شائع کیے تھے، ان میں وہ بتاتا ہے کہ قدیم شہر افسس کے کھنڈرات سے متصل ایک پہاڑی پر اس نے حضرت مریمؑ اور "سات لڑکوں" یعنی اصحاب کہف کے مبقروں کے آثار پائے ہیں۔"

(تفہیم القرآن جلد سوم صفحہ 19)

کیا آج کا کوئی مسلمان محقق بطرا اور شہر افسوس کے کھنڈروں کا مطالعہ و معائنہ کر کے یہ فیصلہ نہیں کر سکتا کہ یہ واقعہ کس شہر میں پیش آیا؟

اگر ایسی تحقیق ہو چکی ہے تو اسے مشتہر کرنا لازمی ہے۔

واللہ اعلم بالصواب

(تمت بالخیر)

فردوس

3 اگست 1996ء

فردوس، جنت کے لیے معروف ترین لفظ ہے جو قریب قریب تمام انسانی زبانوں میں مشترک طور پر پایا جاتا ہے۔ سنسکرت میں "پیردیشا" قدیم کلدانی زبان میں "پردیسا" قدیم ایرانی (ژند) میں "پیری دائزا"، عبرانی میں "پردیس"، ارمنی میں

’’پردیز‘‘، سریانی میں ’’فردیسو‘‘، یونانی میں ’’پارادائسوس‘‘، لاطینی میں ’’پاراڈائسس‘‘ اور عربی میں ’’فردوس‘‘۔

یہ لفظ ان سب زبانوں میں ایک ایسے باغ کے لیے بولا جاتا ہے جس کے گرد حصار کھنچا ہوا ہو، وسیع ہو، آدمی کی قیام گاہ سے متصل ہو اور اس میں ہر قسم کے پھل خصوصاً انگور پائے جاتے ہیں۔ بلکہ بعض زبانوں میں تو منتخب پالتو پرندوں اور جانوروں کا بھی پایا جانا اس کے مفہوم میں شامل ہے۔ قرآن سے پہلے عرب کے کلام جاہلیت میں بھی لفظ فردوس مستعمل ہے اور قرآن میں اس کا اطلاق متعدد باغوں کے مجموعے پر کیا گیا ہے جیسا کہ سورہ کہف میں ارشاد ہوا ’’..........ان کی میزبانی کے لیے فردوس کے باغ ہیں۔ اس سے جو تصور ذہن میں آتا ہے وہ یہ کہ فردوس ایک بڑی جگہ ہے جس میں بکثرت باغ اور چمن اور گلشن پائے جاتے ہیں۔

(تفہیم القرآن از مولانا مودودی جلد سوم صفحہ 268۔ نوٹ 10)

راقم الحروف:

انگریزی کا لفظ پیراڈائیز (Paradise) قدیم ایرانی (ژند) کے ’’پیری ڈائز‘‘ سے بہت قریب ہے۔

دھماکے

30 مئی 1998ء

قریباً دو سال بعد اس ڈائری میں کچھ لکھ رہا ہوں۔

لکھنے کو تو بہت کچھ تھا لیکن نہ جانے لکھنے کو جی کیوں نہ چاہا۔

مثلاً دو سالگرہیں آئیں اور 1997ء کی سالگرہ پر میرے برادر خرد پروفیسر سجاد حسین نقوی نے میرے چار چھوٹے چھوٹے سفرناموں پر مشتمل ایک کتاب اپنے خرچ پر شائع کی۔ اس کا عنوان ہے ’’ٹرمینس سے ٹرمینس تک‘‘ جب جولائی 1997ء

میں کراچی گئے تو عزیزان ڈاکٹر عقیل نقوی اور ڈاکٹر روبینہ عقیل نے مہران ہوٹل میں اس پر ایک مختصر سی تقریب کا انتظام کیا جس میں کراچی کے بیس اکیس مہربان ادیب شامل ہوئے اور کراچی کے اخبارات میں اس تقریب کی خبر بھی چھپی اور کتاب پر تبصرے بھی۔

تاحال اس کتاب کے 13 نسخے فروخت ہوئے ہیں۔ یوں دوسو کے قریب کتاب بانٹی جاچکی ہے۔ حالت یہ ہے کہ جن دانشور دوستوں کو کتاب اعزازی طور پر بھیجی گئی، ان میں سے اکثر نے اس کی رسید تک نہیں دی۔ یہ ہے کتاب کی ناقدری کا موجودہ عالم۔

ان دوستوں کو اگر میں نرالا سویٹس کا ایک ایک کلو کا ڈبا بھیج دیتا، تو جواب میں شکریے کی میٹھی ڈلی ضرور وصول ہو جاتی۔

اس کتاب کی قیمت 130 روپے ہے اور نرالا سویٹس کی مٹھائی کا ایک کلو 160 روپے میں آتا ہے۔

14 اگست 1997ء کو پاکستان کی گولڈن جوبلی تھی۔ اسے خاصے طمطراق سے منایا گیا۔ کچھ سیمینار ہوئے۔ ٹیلی ویژن پر کچھ جلسے جلوس دیکھے۔ کچھ نمبر نکلے۔ نہایت روٹین قسم کے۔ روح سے عاری اور جذبے سے محروم۔ میں نے دو مضمون لکھے ''افکار پریشاں'' اور معجزہ در معجزہ۔ ان میں پاکستان کے گزشتہ پچاس سالوں کی ایک غیر معروضی روداد لکھی گئی کیونکہ پاکستان کے پچاس سالوں کے ہر لمحے میں میں خود بھی شریک تھا۔ میں اپنے آپ کو ان سے کیسے الگ کر سکتا تھا؟

ایک ادبی مضمون بھی لکھا یعنی اردو افسانے کے گزشتہ پچاس سالوں کا جائزہ اپنی ذات کے حوالے سے لکھا۔

''افکار پریشان'' چہار سو کے ایک شمارے میں چھپا۔

''معجزہ در معجزہ'' مئی 1998ء کے ''حکایت'' کے شمارے میں طبع ہوا اور ''اردو افسانے کے پچاس سال'' اوراق 1997ء کے ایک شمارے میں۔

سب سے اہم واقعہ ''دھماکوں'' کا ہے۔

11 مئی کو خبروں میں سنا کہ بھارت نے ایٹمی دھماکا کر دیا ہے۔ یہ خبر سن کر اعصاب پر بہت بُرا اثر پڑا۔ یہی محسوس ہو رہا تھا کہ بھارت اگلا دھماکا 'کہوٹہ' پر کرے گا۔ نہیں.......... اصل میں خوف اس بات کا تھا کہ بھارت نے یہ دھماکا کر کے ''پاکستان'' کو سرنگوں کر دیا ہے۔ اس سے قبل غوری میزائل کا کامیاب تجربہ ہوا تھا اور ہر پاکستانی کا سر فخر سے بلند ہو گیا تھا۔ اخبارات (خاص طور پر نوائے وقت) نے مسلسل ادارئے اور کالم شائع کیے کہ جواب میں دھما کا ضرور ہونا چاہیے۔

میں ایک سیدھا سادا پاکستانی ہوں۔ جہاں تک پاکستانیت کا تعلق ہے، میری ذات میں کوئی ایچ پیچ نہیں۔ میں ابھی تک 1971ء میں پاکستان کو جو شکست ہوئی تھی، اس کی خفت میں مبتلا ہوں۔ ایک فرد پوری قوم کو اپنی ذات میں دیکھ سکتا ہے۔ میرا مورال پست ہوا تو میں نے یہی جانا کہ پوری قوم کا مورال پست ہوا ہے۔

جب 28 مئی 1998ء کی سہ پہر کو پاکستان کے وزیرِاعلیٰ میاں محمد نواز شریف نے اعلاج کیا کہ آج صبح 8 بجے ہم نے چاغی کے مقام پر پانچ کامیاب دھماکے کیے ہیں تو میں نے پوری قوم کا مورال اپنی ذات کے اندر بلند ہوتا ہوا محسوس کیا جیسے ذرّے میں آفتاب اور قطرے میں دجلہ نظر آتا ہے۔ زندہ باد پاکستان!

31 جولائی 1998ء

اس صفحے کی پشت پر سید محمد حسین طباطبائی (علم الہدیٰ) کے حالات ملاحظہ ہوں۔ اس بچے کی عمر 5 (پانچ) سال ہے۔ یہ بچہ اللہ تعالیٰ کی قدرت تخلیق کا ایک معجزہ ہے۔

مجھے اس بچے کے والد محترم کے اس بیان سے اتفاق نہیں۔

''اس کی ذہانت غیر معمولی نہیں۔ اللہ نے سب بچوں کو اس جیسی صلاحیتیں عطا کی ہیں۔ اگر بچوں کو ہمدرد اساتذہ میسر آ جائیں جو

